قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۲   شمارہ: ۹-۱۰
رمضان وشوال: ۱۴۴۰ھ - جون: ۲۰۱۹ء
قیمت شمارہ ہذا: ۷۰ روپے ، زرِ سالانہ: ۴۰۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات'' جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ
انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا
وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن
فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

رمضان کی عظمت، حرمت اور فضیلت !! — ۳ — محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل ! — ۱۱ — محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ — ۱۶ — انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

اسلام اور سیکولرزم (قسط:۱) — ۲۱ — مفتی عبدالرؤف غزنوی

فقہ اور اصولِ فقہ کی تدریس ! (قسط:۳) — ۳۱ — مفتی رفیق احمد بالاکوٹی

شرعی عائلی احکام کی دفعہ بندی: متن قانونِ ثبوتِ نسب (قسط:۳) — ۵۴ — مفتی شعیب عالم

حج سے متعلق قرآن کریم کی رہنمائی (ثلاثیات... فوائد) — ۵۶ — مولانا فخر الاسلام المدنی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر سے متعلق اہم توضیح — ۶۴ — مولانا محمد عبدالحمید تونسوی

دنیا و آخرت کی کامیابی، سات [۷] صفات میں مضمر — ۶۹ — ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی

جامعہ بنوری ٹاؤن کا تعلیمی منہج اور کردار... ایک تحقیقی مطالعہ (قسط:۱) — ۷۴ — ڈاکٹر مولانا انعام اللہ

اسلامی معاشرے میں قوانین کی پابندی — ۸۸ — مفتی سردار محمد اشرفی

خلیفہ بلافصل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (احادیث کی روشنی میں) — ۹۱ — مولانا محمد مجاہد بن خلیل

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا سید واضح رشید ندویؒ (ندوۃ العلماء، لکھنؤ) — ۹۵ — مولانا عبدالمتین منیری

حضرت مولانا جمیل احمد قاسمی سکروڈھویؒ (دارالعلوم دیوبند) — ۱۰۴ — مولانا شفیق احمد بستوی

دار الافتاء

عورت کا فرض نماز اور تراویح با جماعت کے لیے
مساجد میں حاضر ہونا — ۱۱۰ — ادارہ

نقد و نظر

۱۱۳ — ادارہ

رمضان کی عظمت، حرمت اور فضیلت!!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اشرف و اکرم بنایا، اس کی فطرت میں نیکی اور بدی، بھلائی اور برائی، تابعداری وسرکشی اور خوبی وخامی دونوں ہی قسم کی صلاحیتیں اور استعدادیں یکساں طور پر رکھ دی ہیں۔ اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ کسی بھی انسان سے اچھائی اور برائی دونوں ہی وجود میں آسکتی ہیں۔ ایک انسان سے حسنات بھی ممکن ہیں اور سیئات بھی، اس کے باوجود کوئی سیئات ومعصیات سے مجتنب ہوکر اپنی زندگی اور اس کے قیمتی لمحات کو حسنات وطاعات سے مزین اور آراستہ کرلے تو یہ اس کے کامیاب اور خالق ومخلوق کے نزدیک اشرف واکرم ہونے کی سب سے بڑی نشانی ہے اور یہی تقویٰ وپرہیزگاری ہے جو روزہ کا مقصدِ اصلی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’یٰـأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ أَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ ۔‘‘ (البقرۃ:۱۸۳،۱۸۴)

’’اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ، جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر، تاکہ تم پرہیزگار ہوجاؤ، چندروز ہیں گنتی کے۔‘‘

تقویٰ کا معنی ہے: نفس کو برائیوں سے روکنا اور اس کا سب سے بڑا ذریعہ روزہ ہے، جیسا کہ

ایک صحابیؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے کسی ایسے عمل کا حکم دیجیے جس سے حق تعالیٰ مجھے نفع دے''، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''**علیک بالصوم، فإنهٗ لامثل لهٗ**'' (سنن نسائی، ج:۱،ص:۱۴۰)...... ''یعنی روزہ رکھا کرو، اس کے مثل کوئی عمل نہیں۔'' اب رمضان المبارک کی آمد آمد ہے، گویا یہ مہینہ نیکیوں اور طاعات کے لیے موسمِ بہار کی طرح ہے، اسی لیے رمضان المبارک سال بھر کے اسلامی مہینوں میں سب سے زیادہ عظمتوں، فضیلتوں اور برکتوں والا مہینہ ہے۔ اس ماہ میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنی رضا، محبت وعطا، اپنی ضمانت واُلفت اور اپنے انوارات سے نوازتے ہیں۔ اس مہینہ میں ہر نیک عمل کا اجر وثواب کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس ماہ میں جب ایمان اور احتساب کی شرط کے ساتھ روزہ رکھا جاتا ہے تو اس کی برکت سے پچھلی زندگی کے تمام صغیرہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور جب رات کو قیام (تراویح) اسی شرط کے ساتھ کیا جاتا ہے تو اس سے بھی گزشتہ تمام گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اس ماہ میں ایک نیکی فرض کے برابر اور فرض ستر فرائض کے برابر ہوجاتا ہے، اس ماہ کی ایک رات جسے شبِ قدر کہا جاتا ہے وہ ہزار مہینوں سے افضل قرار دی گئی ہے۔

رمضان کا روزہ فرض اور تراویح کو نفل (سنت مؤکدہ) بنایا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے، اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور خیر خواہی کا مہینہ ہے، اس میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، اس میں روزہ افطار کرنے والے کی مغفرت، گناہوں کی بخشش اور جہنم سے آزادی کے پروانے کے علاوہ روزہ دار کے برابر ثواب دیا جاتا ہے، چاہے وہ افطار ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی سے ہی کیوں نہ کرائے، ہاں! اگر روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھلایا یا پلایا تو اللہ تعالیٰ اسے حوضِ کوثر سے ایسا پانی پلائیں گے جس کے بعد وہ جنت میں داخل ہونے تک پیاسا نہ ہوگا۔ اس ماہ کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا مغفرت اور تیسرا جہنم سے آزادی کا ہے۔ جس نے اس ماہ میں اپنے ماتحتوں کے کام میں تخفیف کی تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ اس کی مغفرت اور اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ دیں گے۔ پورا سال جنت کو رمضان المبارک کے لیے آراستہ کیا جاتا ہے۔ عام قانون یہ ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس سے لے کر سات سو تک دیا جاتا ہے، مگر روزہ اس قانون سے مستثنیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''روزہ صرف میرے لیے ہے اور اس کا اجر میں خود دوں گا۔'' روزہ دار کو دو خوشیاں ملتی ہیں: ایک افطار کے وقت کہ اس کا روزہ مکمل ہوا اور دعا قبول ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے روزہ افطار کیا اور دوسری خوشی جب اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی۔ روزہ دار کے منہ کی بو (جو معدہ کے خالی ہونے کی وجہ سے آتی ہے) اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے زیادہ خوشبودار ہے۔ روزہ اور قرآن کریم

دونوں بندے کی شفاعت کریں گے اور بندے کے حق میں دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی ۔

اب چند وہ باتیں عرض کی جاتی ہیں، جن کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اہتمام کیا کرتے تھے اور اُمت کو بھی اس کی تعلیم اور تلقین فرماتے تھے:

۱:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شعبان کی تاریخوں کی جس قدر نگہداشت فرماتے تھے اتنا دوسرے مہینوں کی نہیں فرماتے تھے ۔

۲:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان کی خاطر شعبان کے چاند کا اہتمام کیا کرو ۔

۳:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری کھانے کا حکم فرمایا کہ: ''سحری کھایا کرو، کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے ۔'' اور فرمایا: ''ہمارے اور اہل کتاب کے روزے کے درمیان سحری کھانے کا فرق ہے ۔'' یعنی اہلِ کتاب کو سو جانے کے بعد کھانا پینا ممنوع تھا اور ہمیں صبح صادق کے طلوع ہونے سے پہلے تک اس کی اجازت ہے ۔

۴:- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگ ہمیشہ خیر پر رہیں گے جب تک کہ (غروب آفتاب کے بعد) افطار میں جلدی کرتے رہیں گے ۔''

افطار کی دعا: ''ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ. ''..... ''پیاس جاتی رہی، انتڑیاں تر بتر ہوگئیں اور اجر ان شاء اللہ ثابت ہوگیا ۔'' اسی طرح: ''اَللّٰهُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ أَفْطَرْتُ ۔''..... ''اے اللہ! میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے رزق سے افطار کیا ۔''

۵:- رمضان میں ذکر کرنے والا بخشا جاتا ہے اور اس ماہ میں مانگنے والا بے مراد نہیں رہتا ۔

۶:- روزہ دار کی روزانہ ایک دعا قبول ہوتی ہے ۔

۷:- رمضان میں روزانہ بہت سے لوگ دوزخ سے آزاد کیے جاتے ہیں ۔

۸:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے اخیر عشرہ میں خود بھی شب بیدار رہتے اور اپنے گھر کے لوگوں کو بھی بیدار رکھتے ۔

۹:- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شبِ قدر کو رمضان کے اخیر عشرہ میں تلاش کرو ۔

۱۰:- جب لیلۃ القدر آتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی معیت میں نازل ہوتے ہیں اور ہر بندہ جو کھڑا یا بیٹھا اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو (اس میں تلاوت، تسبیح وتہلیل اور نوافل سب شامل ہیں، الغرض کسی طریقے سے ذکر وعبادت میں مشغول ہو) اس کے لیے دعائے رحمت کرتے ہیں ۔

۱۱:- لیلۃ القدر کی دعا: ''اَللّٰهُمَّ إِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ ۔''.... ''اے اللہ!

آپ بہت معاف کرنے والے ہیں، معافی کو پسند فرماتے ہیں، پس مجھے بھی معاف فرمادیجیے۔‘‘

۱۲:- اگر کسی نے بغیر عذر اور بیماری کے رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دیا، خواہ وہ ساری زندگی روزہ رکھتا رہے، وہ اس کی تلافی نہیں کرسکتا۔

۱۳:- رمضان میں چار کام کثرت سے کیے جائیں: دو کام جن سے اللہ راضی ہوتے ہیں: ا:- ’’لاإلٰہ إلا اللّٰہ ‘‘ کی کثرت ،۲:- استغفار زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ اور دو کام جو ہر انسان کی ضرورت ہیں: ا:- اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کیا جائے ،۲:- جہنم سے پناہ مانگی جائے۔

۱۴:- تراویح کے بارہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’جس نے ایمان کے جذبے سے اور ثواب کی نیت سے رمضان کا روزہ رکھا، اس کے پہلے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا، ایمان کے جذبے اور ثواب کی نیت سے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔‘‘

۱۵:- اعتکاف کے بارہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جس نے رمضان میں (آخری) دس دن کا اعتکاف کیا، اس کو دو حج اور دو عمرے کا ثواب ہوگا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی خاطر ایک دن کا بھی اعتکاف کیا، اللہ تعالیٰ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایسی تین خندقیں بنادیں گے کہ ہر خندق کا فاصلہ مشرق ومغرب سے زیادہ ہوگا۔‘‘

۱۶:- رمضان میں قرآن کریم کا دور اور جود وسخاوت کی جائے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جود وسخا میں تمام انسانوں سے بڑھ کر تھے اور رمضان میں آپ کی سخاوت بہت بڑھ جاتی تھی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام رمضان کی ہر رات میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم کا دور کیا کرتے تھے۔

۱۷:- روزہ کی حالت میں بے ہودہ باتوں: مثلاً: غیبت، بہتان، گالی گلوچ، لعن، طعن، غلط بیانی، تمام گناہوں سے پرہیز کیا جائے، ورنہ سوائے بھوکا پیاسا رہنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اگر کوئی دوسرا آکر ناشائستہ بات کرے تو یہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں، کیونکہ روزہ ڈھال ہے، جب تک کوئی اس کو پھاڑے نہیں اور یہ ڈھال جھوٹ اور غیبت سے پھٹ جاتی ہے۔

یہ مہینہ گویا ایمان اور اعمال کو ریچارج کرنے کے لیے آتا ہے۔ رمضان عربی کا لفظ ہے، جس کا اُردو میں معنی ہی شدتِ حرارت کے ہیں، یعنی اس ماہ میں اللہ رب العزت روزہ کی برکت اور اپنی رحمتِ خاصہ کے ذریعہ اہلِ ایمان کے گناہوں کو جلا دیتے اور ان کی بخشش فرمادیتے ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

’’إذا دخل رمضان فُتحت أبواب السماء، وفی روایۃ: ’’فُتحت أبواب الجنۃ ‘‘

وغُـلـقـت أبـواب جهـنـم ، وسُـلسـلت الشياطين، وفى رواية ’’فُتـحـت أبواب الرحمة.‘‘ (متفق علیہ، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الصوم،ص:۱۷۳)

’’رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جب رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کردیئے جاتے ہیں اور شیاطین جکڑ دیئے جاتے ہیں، اور ایک روایت میں بجائے ابوابِ جنت کے ابوابِ رحمت کھول دیئے جانے کا ذکر ہے۔‘‘

’’قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: یہ حدیث ظاہری معنوں پر بھی محمول ہوسکتی ہے، لہٰذا جنت کے دروازوں کا کھلنا، دوزخ کے دروازوں کا بند ہونا اور شیطانوں کا قید ہونا اس مہینے کی آمد کی اطلاع اور اس کی عظمت اور حرمت وفضیلت کی وجہ سے ہے، شیاطین کا بند ہونا اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو وسوسوں میں مبتلا کر کے ایمانی وروحانی اعتبار سے ایذا نہ پہنچاسکیں، جیسا کہ دستورِ زمانہ بھی ہے کہ جب کوئی اہم موقع ہوتا ہے تو خصوصی انتظامات کیے جاتے ہیں، تمام شر پسندوں کو قید کردیا جاتا ہے، تاکہ وہ اس موقع پر کوئی رخنہ وفتنہ پیدا نہ کریں، اور حکومت اپنے حفاظتی دستوں کو ہر طرف پھیلا دیتی ہے، یہی حال رمضان المبارک میں بھی ہوتا ہے کہ شیطانوں کو قید کردیا جاتا ہے۔ اور اس سے مجازی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں، کیوں کہ شیاطین کا اُکسانا اس ماہ میں کم ہوجاتا ہے، اس لیے گویا وہ قید ہوجاتے ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت کے دروازے کھولنے سے مراد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر طاعات اور عبادات کے دروازے اس ماہ میں کھول دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو عبادتیں کسی اور مہینے میں عام طور پر واقع نہیں ہوسکتیں، وہ عموماً رمضان میں بآسانی ادا ہوجاتی ہیں، یعنی روزے رکھنا، قیام کرنا، وغیرہ۔‘‘ (نووی شرح مسلم، از برکاتِ رمضان، ص:۴۴)

الغرض رمضان المبارک کی بڑی فضیلت ہے، اسی وجہ سے کہا گیا کہ اگر لوگوں کو رمضان المبارک کی ساری فضیلتوں اور برکتوں کا پتہ چل جائے تو وہ تمنائیں کریں کہ کاش! سارا سال رمضان ہوجائے۔

رمضان المبارک کی بے شمار خصوصیتیں ہیں، جن میں چند ایک یہ ہیں:

۱:- سال بھر کے مہینوں میں رمضان المبارک ایک ایسا مہینہ ہے جس کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن کریم میں آتا ہے، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

’’شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔‘‘ (البقرۃ: آیت:۱۸۵)

’’رمضان وہ (مبارک) مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لیے راہنمائی، ہدایت اور حق و باطل میں تمیز کرنے کا ذریعہ ہے، پس جو کوئی یہ (مبارک) مہینہ پائے اُسے چاہیے کہ وہ اس کے روزے رکھے۔‘‘

۲:- اسی ماہ کو شبِ قدر میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر مکمل قرآن کریم کا نزول ہوا، جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے:

’’إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَا أَدْرَاکَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ تَنَزَّلُ الْمَلٰئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔‘‘ (القدر:۳-۵)

’’بلا شبہ ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا، اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شبِ قدر کیسی چیز ہے؟ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اس رات میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر معاملہ لے کر حاضر ہوتے ہیں، یہ رات سراسر سلامتی ہے، وہ یعنی اس کی خیر و برکت صبح طلوعِ فجر تک رہتی ہے۔‘‘

گویا رمضان اور قرآن کریم دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے کہ قرآن رمضان میں آیا تو رمضان کا تذکرہ قرآن کریم میں آیا، اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ: رمضان اور قرآن کا جسم اور روح کا سا تعلق ہے۔ رمضان جسم ہے تو قرآن کریم روح ہے:

ماہِ صیام تیرا کیوں نہ ہو احترام
کہ نازل ہوا تجھ میں اللہ کا کلام

اس لیے ہمارے اکابر نے رمضان میں روزہ اور تراویح کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کو سب سے بہتر عبادت قرار دیا۔

۳:- رمضان کی ہر رات ایک منادی اعلان کرتا ہے: ’’يا باغي الخير! أقبل ويا باغي الشر! اقصر۔‘‘ (مشکوٰۃ، ص:۱۷۳)..... ’’اے خیر کے طالب! آگے بڑھ، اور اے شر کے طالب! رُک جا۔‘‘ یعنی خیر کے متلاشی اللہ تعالیٰ کی رضا والے کاموں میں مشغول ہو اور اس کی نافرمانی اور گناہوں سے باز آجا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اثر اور ظہور ہر آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ رمضان میں اہلِ ایمان کا عموماً رجحان اور میلان نیکیوں اور عبادات کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: منبر کے قریب ہوجاؤ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منبر سے قریب ہوگئے۔ جب حضور ﷺ نے منبر کے پہلے درجہ پر قدم مبارک رکھا تو فرمایا: آمین۔ جب دوسرے پر قدم مبارک رکھا تو پھر فرمایا: آمین۔ جب تیسرے پر قدم مبارک رکھا تو پھر فرمایا: آمین۔ جب آپ ﷺ خطبہ سے فارغ ہوکر نیچے اُترے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ: (یا رسول اللہ!) ہم نے آج آپ سے (منبر پر چڑھتے ہوئے) ایسی بات سُنی جو پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس وقت جبرائیل علیہ السلام میرے سامنے آئے تھے (جب پہلے درجہ پر میں نے قدم رکھا تو) اُنہوں نے کہا: ہلاک ہوجائے وہ شخص جس نے رمضان المبارک کا مبارک مہینہ پایا، پھر بھی اس کی مغفرت نہ ہوئی، میں نے کہا: آمین۔ پھر جب میں دوسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا: ہلاک ہوجائے وہ شخص جس کے سامنے آپ ﷺ کا ذکر مبارک ہو اور وہ درود نہ بھیجے، میں نے کہا: آمین۔ جب میں تیسرے درجہ پر چڑھا تو انہوں نے کہا: ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے اس کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بڑھاپے کو پائے اور وہ ان کی خدمت کرکے جنت میں داخل نہ ہوجائے۔ میں نے کہا: آمین۔ (مستدرک حاکم)

رمضان المبارک ایک ایسا مہینہ ہے کہ اس میں ایک انسان کوشش کرے تو ایک رمضان سارے گناہ بخشوانے کے لیے کافی ہے، جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور یہ یقین کرکے رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام وعدے سچے ہیں اور وہ تمام اعمالِ حسنہ کا بہترین بدلہ عطا فرمائے گا تو رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

> ’’**من قام رمضان إيمانًا واحتسابًا غفر لهٗ ماتقدم من ذنبهٖ وماتأخر.**‘‘ (المؤطا بروایۃ محمد بن الحسنؒ)
>
> ’’جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے رمضان میں قیام کرے گا (یعنی تراویح اور نوافل وغیرہ پڑھے گا) اس کے پچھلے اور اگلے سب (صغیرہ) گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔‘‘

ایمان اور احتساب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں پر یقینِ کامل ہو اور ہر عمل پر ثواب کی نیت اور اخلاص وللّٰہیت اور رضائے الٰہی کا حصول پیشِ نظر ہو۔

۴:- دین کے جتنے ارکان ہیں وہ طاقت پیدا کرتے ہیں، یعنی ایک عبادت دوسری عبادت کے لیے معاون ومددگار اور تقویت کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح سے رمضان کا روزہ سال کے پورے گیارہ مہینے کی عبادت کے لیے طاقت پیدا کرتا ہے۔ روزہ کی وجہ سے دوسری عبادات کی ادائیگی کا

ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے اور توانائی ملتی ہے ۔ اگر فرض روزہ کے تمام تقاضوں کا لحاظ رکھا گیا تو اس کا اثر پورے گیارہ مہینوں پر پڑے گا اور روزہ دار کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی ہوگی ۔

۵:- روزہ جن چیزوں سے معمور کیا گیا ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے ۔ روزہ کا منشأ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا جائے ، یعنی روزہ کے ساتھ ساتھ تراویح ، اشراق ، چاشت ، اوابین ، صلاۃ الحاجۃ ، صلاۃ التسبیح ، تلاوتِ قرآن ، اللہ تعالیٰ کا ذکر ، صدقہ ، خیرات ، عشرۂ اخیرہ کے اعتکاف کی کوشش ، شبِ قدر کی تلاش اور دعاؤں کی کثرت کا معمول بنایا جائے اور جتنا ہوسکے ان پر عمل کیا جائے ۔

اس ماہ میں غریبوں ، یتیموں ، بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ ایثار اور ہمدردی کا معاملہ کیا جائے ، ان پر سخاوت کی جائے ، یہ اس لیے کہ ایک تو ان کا حق ہے اور دوسرا اس لیے کہ صدقہ وخیرات کرنے سے ممکن ہے کہ اللہ کے کسی بندے کا دل خوش ہوجائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور ہمارا مقصد پورا ہوجائے ۔ یا ہوسکتا ہے ہماری عبادت ، ہماری تلاوت ، ہماری نمازوں میں کوئی کمی رہ گئی ہو یا اس قابل نہ ہوں کہ وہ قبولیت کا مقام حاصل کرسکیں تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمالیں ، اس لیے اس ماہ میں ہمیں پوری طرح خیرات وصدقات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے ۔

بہرحال اس کی عظمتوں ، برکتوں اور خصوصیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حرمت کا پورا لحاظ رکھے کہ رمضان اللہ تعالیٰ کا شاہی مہمان ہے ، جو ہمارے پاس بوجھ بن کر نہیں ، رحمت کی موج بن کر آتا ہے ، اس لیے اس کے منافی کوئی کام نہ کریں ۔

علماء نے لکھا ہے کہ : '' ایک یہودی نے اپنے بیٹے کو رمضان کے دن میں کھاتے دیکھا تو اُسے مارا کہ تو نے اس کی حرمت کو باقی نہ رکھا ، کہتے ہیں کہ پھر اسی ہفتہ اس کا انتقال ہوگیا تو شہر کے کسی عالم نے خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں ہے ، تعجب سے پوچھا : '' میاں ! تم یہاں کیسے ؟ '' تو اس نے کہا : '' جب میری موت کا وقت آیا تو حرمتِ رمضان کی وجہ سے مجھے کلمہ پڑھا کر مشرف باسلام کردیا گیا ، اور الحمد للہ ! میرا خاتمہ ایمان پر ہوا ۔ '' (نزہۃ المجالس ، مترجم : ۱: ۳۲۵)

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں رمضان المبارک کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، ہماری تمام عبادات کو قبول فرمائے اور آخرت میں حضور اکرم ﷺ کی شفاعت کے طفیل جنت الفردوس نصیب فرمائے ۔ آمین

وصلّی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

مسلمانوں کے لیے لائحہ عمل !

محدث العصر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

آیئے! ان تازہ حقائق کی روشنی میں غور کریں کہ مسلمانوں کا آئندہ لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے، مسلمانوں پر حق تعالیٰ شانہٗ کا یہ عظیم احسان ہے کہ ان کے پاس ہر شعبۂ زندگی کی طرح صلح و جنگ کے لیے بھی آسمانی وربانی ہدایات موجود ہیں۔ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں صلح و جنگ اور اعداءِ اسلام اور منافقین کے مقابلہ کا مفصل دستور العمل موجود ہے، قرآن کریم کا کتنا صاف اعلان اور واضح مطالبہ تھا:

''وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَاتَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔'' (الانفال:۶۰)

''اور ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعہ تم رعب جمائے رکھو اُن پر، جو کہ اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے، ان کو اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے لیے کچھ کمی نہیں ہوگی۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ ارشادِ ربانی مسلمانوں پر بطور خاص یہ فریضہ عائد کرتا ہے کہ ان کے پاس ہمہ وقت اتنی قوت موجود رہنا ضروری ہے جس سے اعداءِ اسلام مرعوب، خائف اور لرزہ براندام رہیں اور پوری مسلم قوم کو اس کی تیاری میں مصروف رہنا چاہیے۔

مگر مسلمانوں پر صدیوں سے ایک جمود سا طاری ہے اور وہ نفس پرستی، عیش کوشی اور اغراض پرستی

کی دلدل میں کچھ ایسے پھنسے ہیں کہ عرصہ دراز سے مسلمان حکومتوں نے اس فریضۂ الٰہی سے تغافل اختیار کر رکھا ہے اور سورۂ توبہ وانفال کی واضح ہدایات کے ہوتے ہوئے غفلت و جہالت کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں، جبکہ اعداء اسلام' اسلام دشمنی سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ اس دردناک غفلت و بے عملی کے جو نتائج سامنے آنے تھے وہ ظاہر ہوکر رہے، جس طرح دواؤں اور غذاؤں کے خواص ہیں، اسی طرح اعمال کے بھی خواص ہیں، جو شخص زہر کھاتا ہے وہ ہلاک ہوگا، اسی طرح ان ارشادات سے روگردانی کی سزا کو سمجھ لیجئے۔

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو کلیدی مقامات عطا فرمائے، دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ دنیا کا قلب اب بھی مسلمانوں کے حیطۂ اقتدار میں ہے اور قدرت نے نقشہ کچھ ایسا رکھا کہ تمام عالمِ اسلام باہم مربوط اور ایک اسلامی ملک کی سرحدیں دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، پھر مسلم ممالک خصوصاً عرب ممالک کو مادی وسائل کی وہ فراوانی عطا فرمائی کہ عقل حیران ہے، اگر ان وسائل کو اسلامی ترقی اور فوجی طاقت مہیا کرنے پر صرف کیا جاتا تو عالمِ اسلام کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور آج یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا، اب اگر عرب اور مسلم ممالک یہ چاہتے ہیں کہ ان کفار اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں سے محفوظ رہیں، تو مندرجہ ذیل تدبیر پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے:

الف:......قومیت، وطنیت اور جنسیت کے مادی روابط سے بالاتر ہوکر صرف اسلام کے ''العروۃ الوثقٰی'' اور ''حبل متین'' کو مضبوطی کے ساتھ تھاما جائے اور مغرب کی تمام لعنتوں کو خیرباد کہہ کر نئے سرے سے اسلام سے وفاداری کا عہد کیا جائے اور باہمی اتفاق واتحاد کے رشتے مضبوط کیے جائیں، تمام اسلامی ممالک یکجان دوقالب ہوکر ہر قسم کے باہمی نفاق وشقاق اور حسد وکبر کو دل سے نکال دیں، یہ یقین دلوں میں جاگزیں ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی عزت اسلام اور اسلامی زندگی کے اپنانے میں منحصر ہے، اسلام سے انحراف کر کے اور اس کی ہدایات کو پسِ پشت ڈال کر یہ قوم کبھی سرخرو اور کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ب:......حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے جو مادی وسائل نصیب فرمائے ہیں، ان کے ذریعہ اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کریں اور پوری کوشش کریں کہ جدید سے جدید اسلحہ میں خودکفیل ہوجائیں۔ بلاشبہ اس میں دیر لگے گی، لیکن بیس پچیس سال میں نقشہ ہی بدل جائے گا، اس مقصد کے لیے جرمن، چین اور جاپان سے فنی اعانت حاصل کی جاسکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ معاوضہ دے کر ماہرین کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ کافروں کی خوشامدیں کرنے ان سے بھیک مانگنے اور ان کے رحم

وکرم پر زندگی بسر کرنے کے بجائے جب تک مسلمان اپنے وسائل پر انحصار نہیں کریں گے، تب تک نہ باعزت اور مستغنی قوم کی حیثیت سے دنیا کے نقشہ پر اُبھر سکتے ہیں، نہ ذلت کی وادیوں سے قدم باہر نکال سکتے ہیں۔ چین کی مثال ہمارے سامنے ہے، جو قوم چالیس پچاس سال پہلے افیونی قوم مشہور تھی اور اپنی بے مائیگی میں ضرب المثل تھی، آج وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی کہ امریکہ اور روس بھی اس سے خائف اور اس کے مقابلہ میں منافقانہ ملی بھگت پر مجبور ہیں، ان کی ترقی کا راز سوشلزم نہیں، جیسا کہ ہمارے جہلاء اس کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں، بلکہ اتحاد و اتفاق، غیروں سے استغناء اور اپنے وسائل پر انحصار چین کی ترقی کا باعث ہے۔ الغرض جب تک عرب اور مسلم ممالک اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہوں گے اور ان اعداء اسلام کفار: امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس سے بے نیاز نہ ہوں گے اس وقت تک یہی صورت حال قائم رہے گی، جس کا افسوسناک نقشہ ہمارے سامنے ہے۔

ج:...... آج کل عالمِ اسلام کے اتحاد کی باتیں بہت کی جاتی ہیں، اس کے لیے کانفرنسیں ہوتی ہیں، مقالے پڑھے جاتے ہیں، تجاویز سوچی جاتی ہیں، لیکن اس نکتے سے سب غافل ہیں کہ جب تک سب کا ایک مرکز نہ ہو اور تمام سربراہانِ مملکت اور عوام اپنے مفادات، اپنی ذاتی اغراض اور اپنی انا کو چھوڑ کر ایک مرکزِ ثقل پر جمع ہونے کے لیے آمادہ نہ ہوں ان منتشر ٹکڑوں میں اتحاد کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟! شاید آج کے ماحول میں یہ بات ''دیوانے کی بڑ'' سمجھی جائے گی، لیکن خدالگتی بات یہ ہے کہ جب تک مسلمان خلافتِ اسلامیہ کا احیاء نہیں کریں گے، جسے برطانیہ کی سازش اور کمال اتاترک کی بداندیشی نے ذبح کرڈالا تھا، اس وقت تک عالمِ اسلام نہ متحد ہوگا، نہ اُن کا کوئی مسئلہ حل ہوگا، اب مسلمان چاہیں تو خواہ یہ کام آج کرلیں کہ سب متحد ہوکر ایک ''خلیفۃ المسلمین'' بنائیں اور سب کے سب اس کے جھنڈے تلے جمع ہوجائیں یا کچھ عرصہ مزید ذلیل وخوار ہولیں، کافروں کی کند چھری سے ذبح ہوتے رہیں اور بعد میں جو زندہ رہے گا وہ یہ کام کرلے گا۔ بہرحال مسلمانوں کے مسائل کا آخری حل خلافت کی تاسیس واحیاء ہے۔

مسلمانوں نے ایک بہترین اور بے نظیر قوم کی حیثیت سے دنیا پر حکومت کی ہے، صفحۂ ہستی پر نہایت خوشنما نقوش چھوڑے ہیں اور تاریخِ عالم پر اپنے کارناموں کے زریں باب رقم کیے ہیں، لیکن آج باوجودیکہ قرآن جیسا آسمانی ہدایت نامہ ان کے ہاتھ میں ہے اور خاتم الانبیاء رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ہادیِ برحق ان کا رسول و نبی اور مقتداء و پیشوا ہے، مگر آج اس کی ذلت ونکبت اور بے حسی و بے غیرتی کا تماشا دیکھو کہ یہود وہنود سے مار کھانا پسند کرتے ہیں، لیکن اپنے طویل جمود، عیش پرستی وتن آسانی،

آپس کے کبروغرور اور انانیت ولن ترانی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو پاتے۔ زمین کے خزانے اور دنیا بھر کے وسائل ان کے قبضہ میں ہیں، مگر انہیں کہاں خرچ کیا جارہا ہے؟ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی اور جہاد فی سبیل اللہ پر نہیں، بلکہ تماشوں اور سینماؤں پر، تفریحوں اور کھیلوں پر، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر، کلبوں اور ہوٹلوں پر، إنا للّٰہ۔ حق تعالیٰ کا ارشاد گویا آج ہی ان کے حق میں نازل ہوا ہے:

’’فَلَمَّا أٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ إِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔‘‘ (التوبۃ:۷۶،۷۷)

’’سو جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے (بہت سا مال) دے دیا تو وہ اس میں بخل کرنے لگے اور روگردانی کرنے لگے اور وہ تو روگردانی کے عادی ہیں، سو اللہ تعالیٰ نے اس کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق قائم کردیا جو خدا کے پاس جانے کے دن تک رہے گا، اس سبب سے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدہ میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ اس وعدہ میں شروع ہی سے جھوٹ بولتے تھے۔‘‘

اس آیتِ کریمہ کو بار بار پڑھیے اور غور کیجیے کہ جو ممالک ان کفار مستعمرین کے انتداب سے آزاد ہوئے خواہ وہ فرانس ہو یا برطانیہ، مراکش سے لے کر پاکستان تک کیا ان ممالک نے وعدے پورے کر لیے؟ کیا صحیح اسلامی حکومت قائم کی؟ یا اس کے لیے کوشش کی؟ کوشش تو کیا اس کی خواہش بھی کی؟ جواب نفی میں ملے گا۔ درحقیقت یہ تو ’’بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ‘‘ کی سزا ہے جو روز افزوں تنزل اور ذلت کے گڑھوں میں گرتے جارہے ہیں۔

الغرض مسلمانانِ عالم کو چاہیے کہ تمام قدرت کے عطا کردہ وسائل، اپنی فوجی قوت و طاقت مہیا کرنے پر خرچ کریں اور غریب حکومتیں جہاد کا فنڈ قائم کر کے مسلمانوں سے جہاد کے لیے مال جمع کریں اور صرف اسی صحیح مقصد پر خرچ کریں اور اتفاق واتحاد پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں۔

ان سب تدابیر واسباب کو اختیار کرنے کے بعد توکل واعتماد صرف حق تعالیٰ ہی کی ذات، نصرتِ الٰہی اور اس کی غیبی امداد پر ہو، ان وسائل کو حاصل کرنا اس لیے ضروری تھا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد اور حکم یہی ہے، ایک رستہ تو مسلمانوں کی ذلت کو عزت سے بدلنے کا یہ معلوم ہوتا ہے۔

اس کے سوا ایک راستہ اور بھی ناقص خیال میں آتا ہے، عرب وعجم کے سب مسلمان اسلامی دعوت وتبلیغ کے لیے وقف ہو جائیں، یہ مقصد نہیں کہ تمام کاموں کو چھوڑ کر اس میں لگ جائیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم کا کافی حصہ کفر کے ممالک میں اسلامی اصولوں پر دعوت وتبلیغِ دین کا کام

شروع کرے اور قافلے کے قافلے ہر طرف پھیل جائیں، زیادہ تر توجہ ان ممالک پر مرکوز رکھیں جن قوموں کو اسلام سے سخت عداوت نہ ہو اور ان میں کبر وغرور بھی نہ ہو اور وہ اپنی زندگی سے اُکتا چکے ہیں، سکونِ قلب مفقود کر چکے ہیں، پریشان ہیں، ان کو اسلام کی دعوت دے کر مسلمان بنانے کی کوشش کریں، ان کوششوں کا زیادہ تر دائرہ افریقی ممالک کے علاوہ چین وجاپان کو بنائیں، ہوسکتا ہے کہ کسی وقت یہ طاقتور قومیں اسلام کی حلقہ بگوش ہوجائیں اور مسلمانانِ عالم کا نقشہ ہی بدل جائے:

''وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْا أَمْثَالَكُمْ۔'' (محمد:۳۸)

''اور اگر تم منہ پھیرلو تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے آئیں گے، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے۔''

کا نمونہ سامنے آئے، نبی کریم علیہ صلوات اللہ وسلامہٗ نے کیا یہ دعا نہیں فرمائی ؟!:

''اللّٰهم أيد هذا الدين بأحب الرجلين إليک أبي جهل وعمر۔'' (سنن الترمذی، ابوب المناقب، مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، ج:۲،ص:۲۰۹، ط: فاروقی کتب خانہ)

''اے اللہ! اس دینِ اسلام کو دو آدمیوں میں سے جو آپ کو پسند ہو، اس کے ذریعہ قوت عطا فرمادیجئے۔''

آج ہم بھی اس سنتِ نبوی کی روشنی میں چین وجاپان کی ہدایت کے لیے یہ دعا کرسکتے ہیں، تبلیغی راستوں سے اس تدبیر میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

الغرض میرے ناقص خیال میں یہی دو تدبیریں ہیں اور اگر دونوں کو جمع کرلیا جائے تو سبحان اللہ! حکمران پہلی تدبیر پر عمل کریں اور علماء اُمت اور عوام دوسری پر عمل پیرا ہوں، اگر یہ اسلامی طریقے اختیار کیے جائیں تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت ان کوششوں کو ضائع نہیں فرمائے گی، اور کم از کم آخرت کی مسئولیت سے تو سبکدوش ہوجائیں گے، انسان کوشش ہی کا مکلّف ہے، نتائج حق تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں:

إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت وما توفيقي إلا بالله وحده عليه توكلت وإليه أنيب

وصلى الله على خاتم النبيين وسيد المرسلين محمد وآله وأصحابه أجمعين إلى يوم الدين

(ذوالقعدہ ۱۳۹۳ھ/ دسمبر ۱۹۷۳ء)

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب وترتیب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مکتوبِ گرامی حضرت شیخ الحدیث زیدت برکاتہم
(تمہید از: حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ)
دینی درس گاہوں کے اربابِ اہتمام کے لیے قابلِ توجہ لمحۂ فکریہ

''بلاشبہ دینی مدارس کا منصب نہایت اونچا اور قابلِ فخر ہے، انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی وراثت ہے، اور جو کچھ قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں فضائل آئے ہیں، کس کو مجال انکار ہوسکتا (ہے؟) لیکن جتنا منصب عالی ہے اس کی قیمت بھی بہت اونچی ہے، وہ صرف رضاء الٰہی اور نعیم جنت ہی ہوسکتی ہے، اگر کوئی اس جو ہر بے بہا کی قیمت متاع دنیا کو بنائے کتنی بڑی شقاوت ہوگی؟! کیا صاف وصریح وعید احادیث میں نہیں آئی؟ مسند احمد وسنن ابی داؤد وابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت (میں) صحیح حدیث سے فرمایا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے: ''**من تعلّم علماً مما يبتغٰى به وجه اللّٰه، لايتعلمه إلا ليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة**''، یعنی ''جس نے وہ علم حاصل کیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوسکتی (ہے) اس کو صرف متاع دنیا کے لیے (حاصل) کیا تو جنت کی خوشبو بھی اس کو نصیب نہ ہوگی۔''

لیکن کتنا مقامِ عبرت وتأسف ہے کہ یہ عظیم الشان، جلیل القدر منصب، منافع دنیا کے لیے وقف ہوگیا ہے! تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، دعوت وارشاد، امامت وخطابت یہ سب دین کے مناصب تھے، آج دنیا کے مناصب بن گئے، سب کا مقصد شکم پروری ہے، اورتن آسانی ہے، یا پھر طلب جاہ ومنزلت ہے، انا للہ!

سنا ہے کہ حضرت فقیہ عصر، محدثِ وقت، عارف باللہ مولانا خلیل احمد (سہارن پوری) رحمہ اللہ

کے سامنے کسی نے خواب بیان کیا کہ: یہ دیکھا کہ درس گاہ میں تپائیوں کے سامنے بجائے طلبہ کے بیل بیٹھے ہوئے ہیں، فرمایا: ''اناللہ! اب سے لوگ علم دین پیٹ کے لیے پڑھیں گے۔''

اور آج کل عام طور پر یہی ہورہا ہے الا ماشاء اللہ، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اساتذہ وطلبہ میں شب خیزی وذکر اللہ وتلاوت قرآن کریم کی عادت ختم ہورہی ہے، نمازِ فجر کے بعد قرآن کریم کی جگہ اخبارات کو مل گئی، ریڈیو اور ٹی وی جیسی منحوس چیزیں جدید تمدن نے گھر گھر پہنچادی ہیں، اناللہ!

بہرحال! مدارس کا جہاں مقصد بدل گیا وہاں عبادت وتلاوت وذکر کی کمی بھی بے حد آگئی ہے، جو ذکر اللہ کی برکات اور تلاوت قرآن کریم کے جو انوار تھے وہ بھی ختم ہوتے جارہے ہیں، ان حالات اور پُرآشوب صورت حال نے ہمارے مخدوم گرامی منزلت حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی **متع اللّٰہ الأمة بحیاتھم الطیبة المبارکة** کو پریشان کررکھا ہے، اسی تاثر کی وجہ سے موصوف نے راقم الحروف کو ایک مفصل والا نامہ لکھا ہے، اربابِ مدارس کی توجہ اور اصلاح کے لیے ذیل میں شائع کیا جارہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اربابِ مدارس کے لیے وسیلۂ عبرت ونصیحت وتوجہ بنائے، آمین!

مکتوبِ مبارک

'' مدارس کے روز افزوں فتن، طلبہ کی دین سے بے رغبتی وبے توجہی اور لغویات میں اشتغال کے متعلق کئی سال سے میرے ذہن میں یہ ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی بہت کمی ہوتی جارہی ہے، بلکہ قریباً یہ سلسلہ معدوم ہوچکا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض میں تو اس لائن سے تنفر کی صورت دیکھتا ہوں، جو میرے نزدیک بہت خطرناک ہے، ہندوستان کے مشہور مدارس دارالعلوم، مظاہرالعلوم، شاہی مسجد مرادآباد وغیرہ کی ابتداء جن اکابر نے کی تھی وہ سلوک کے بھی امام الائمہ تھے، انہی کی برکات سے یہ مدارس ساری مخالف ہواؤں کے باوجود اب تک چل رہے ہیں۔

اس مضمون کو کئی سال سے اہل مدارس منتظمین اور اکابرین کی خدمت میں تقریراً وتحریراً کہتا اور لکھتا رہا ہوں، میرا خیال یہ ہے کہ آپ جیسے حضرات اس کی طرف توجہ فرمادیں تو زیادہ مؤثر اور مفید ہو گا، مظاہرالعلوم میں تو میں کسی درجہ میں اپنے ارادہ میں کامیاب ہوں اور دارالعلوم کے متعلق جناب الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب سے عرض کرچکا ہوں اور بھی اپنے سے تعلق رکھنے والے اہل مدارس سے عرض کرتا رہتا ہوں۔ روز افزوں فتنوں سے مدارس کے بچاؤ کے لیے ضروری ہے کہ مدارس میں ذکر اللہ کی فضا قائم کی جائے، شرور وفتن اور تباہی وبربادی سے حفاظت کی تدبیر ذکر اللہ کی کثرت ہے، جب اللہ تعالیٰ کا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا تو دنیا ختم ہوجائے گی، جب اللہ تعالیٰ کے پاک نام میں اتنی قوت ہے کہ ساری دنیا کا وجود اس سے قائم ہے تو مدارس کا وجود تو ساری دنیا کے مقابلہ میں دریا کے

مقابلہ میں ایک قطرہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو ان کی بقاء وتحفظ میں جتنا دخل ہوگا ظاہر ہے۔

اکابر کے زمانہ میں ہمارے ان جملہ مدارس میں اصحابِ نسبت اور ذاکرین کی جتنی کثرت رہی ہے وہ آپ سے بھی مخفی نہیں اور اب اس میں جتنی کمی ہوگئی وہ بھی ظاہر ہے، بلکہ اگر یوں کہوں کہ اس پاک نام کے مخالف حیلوں اور بہانوں سے مدارس میں داخل ہوتے جارہے ہیں تو میرے تجربہ میں تو غلط نہیں، اس لیے میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں کچھ ذاکرین کی تعداد ضرور ہوا کرے۔

طلبہ کے ذکر کرنے کے تو ہمارے اکابر بھی خلاف رہے ہیں اور میں بھی موافق نہیں، لیکن منتہی طلبہ یا فارغ التحصیل یا اپنے سے یا اپنے اکابرین سے تعلق رکھنے والے ذاکرین کی کچھ مقدار مدارس میں رہا کرے اور مدرسہ ان کے قیام کا کوئی انتظام کردیا کرے، مدرسہ پر طعام کا بار ڈالنا تو مجھے بھی گوارا نہیں، طعام کا انتظام تو مدرسہ کے اکابر میں سے کوئی شخص ایک یا دو اپنے ذمہ لے لے یا باہر سے مخلص دوستوں میں سے کسی کو متوجہ کرکے ایک ایک ذکر کرنے والے کا کھانا کسی کے حوالہ کردیا جائے، جیسا کہ ابتداء میں مدارس کے طلبہ کا انتظام اسی طرح ہوتا تھا، البتہ اہل مدارس ان کے قیام کی کوئی صورت اپنے ذمہ لے لیں جو مدرسہ ہی میں ہو، اور ذکر کے لیے کوئی ایسی مناسب جگہ تشکیل کریں کہ دوسرے طلبہ کا کوئی حرج نہ ہو، نہ سونے والوں کا نہ مطالعہ کرنے والوں کا۔

جب تک اس ناکارہ کا قیام سہارن پور میں رہا تو ایسے لوگ بکثرت رہتے تھے میرے مہمان ہوکر، ان کے کھانے پینے کے انتظام تو میرے ذمہ تھا، لیکن قیام اہل مدرسہ کی جانب سے مدرسہ کے مہمان خانہ میں ہوتا تھا، اور وہ بدلتے سدلتے رہتے تھے، صبح کی نماز کے بعد میرے مکان پر ان کے ذکر کا سلسلہ ایک گھنٹہ تک ضرور رہتا تھا، اور میری غیبت کے زمانہ میں بھی سنتا ہوں کہ عزیز طلحہ کی کوشش سے ذاکرین کی وہ مقدار اگرچہ زیادہ نہ ہو، مگر ۲۰، ۲۵ کی مقدار روزانہ ہوجاتی ہے، میرے زمانہ میں تو سو، سوا سو تک پہنچ جاتی تھی اور جمعہ کے دن عصر کے بعد مدرسہ کی مسجد میں تو دو سو سے زیادہ کی مقدار ہوجاتی تھی اور غیبت کے زمانہ میں بھی سنتا ہوں کہ ۴۰، ۵۰ کی تعداد عصر کے بعد ہوجاتی ہے، ان میں باہر کے مہمان جو ہوتے ہیں وہ دس بارہ تک تو اکثر ہوہی جاتے ہیں، عزیز مولوی نصیرالدین سلمہٗ، اللہ تعالیٰ اس کو بہت جزائے خیر دے ان لوگوں کے کھانے کا انتظام میرے کتب خانہ سے کرتے رہتے ہیں، اسی طرح میری تمنا ہے کہ ہر مدرسہ میں دو چار ذاکرین ضرور مسلسل رہیں، داخلی اور خارجی فتنوں سے بہت امن کی امید ہے، ورنہ مدارس میں جو داخلی اور خارجی فتنے بڑھتے جارہے ہیں، اکابر سے زمانہ میں جتنا بعد ہوتا جائے گا اس میں اضافہ ہی ہوگا۔

اس ناکارہ کو نہ تحریر کی عادت نہ تقریر کی، آپ جیسا یا مفتی محمد شفیع صاحب جیسا کوئی شخص میرے

اس مافی الضمیر کو زیادہ وضاحت سے لکھتا تو شاید اہل مدارس پر اس مضمون کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی، اس ناکارہ کے رسالہ ’’فضائل ذکر‘‘ میں حافظ ابن قیم کی کتاب ’’الوابل الصیّب‘‘ سے ذکر کے سو کے قریب فوائد نقل کئے ہیں، جن میں شیطان سے حفاظت کی بہت سی وجود ذکر کی گئی ہیں، شیاطینی اثر ہی سارے فتنوں اور فساد کی جڑ ہیں، فضائل ذکر سے یہ مضمون اگر جناب سن لیں تو میرے مضمونِ بالا کی تقویت ہوگی، اس کے بعد میرا مضمون تو اس قابل نہیں جو اہل مدارس پر کچھ اثر انداز ہو سکے، آپ میری درخواست کو زوردار الفاظ میں نقل کرا کر اپنی یا میری طرف سے بھیج دیں تو شاید کسی پر اثر ہو جائے۔

دارالعلوم، مظاہر علوم اور شاہی مسجد کے ابتدائی حالات آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہیں کہ کن صاحبِ نسبت اصحابِ ذکر کے ہاتھوں ہوئی ہے؟! انہی کی برکات سے یہ مدارس اب تک چل رہے ہیں، یہ ناکارہ دعاؤں کا بہت محتاج ہے، بالخصوص حسنِ خاتمہ کا کہ گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔

(حضرت شیخ الحدیث مدظلہ، بقلم حبیب اللہ، ۳۰ نومبر ۷۵ء) والسلام، مکہ المکرّمہ‘‘

حضرت بنوریؒ بنام حضرت شیخ الحدیثؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۶/ جمادی الاخریٰ ۱۳۹۵ھ

مخدوم گرامی مآثر حضرت شیخ الحدیث زیدت برکاتہم العالیہ المقبولۃ، آمین!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

نامۂ برکت کی سعادت نصیب ہوئی، بنڈل کے ضائع ہونے کا افسوس ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ! مل جائے گا۔ حضرت والد ماجد کی وفات پر آپ کے تاثرات ودعوات نے ممنون فرمایا، حق تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے آپ کے حسن ظن کو صحیح فرمائے اور مجھے آدمی بنائے، آمین!

مرحوم حضرت مولانا یوسف صاحب (کاندھلوی) کے سوانح میں آپ کے متعلق کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، اس کا افسوس ہے۔ ’’معارف السنن‘‘ کے مقدمہ (میں) کوئی تکوینی ابتلاء پیش آیا ہے، اور اس کی وجہ میں کچھ سمجھ بھی گیا ہوں، دعا فرمائیں کہ میں معاف ہو جاؤں تو قلم آگے چلے، ابتداء تو کوئی ۱۲ سال پہلے ہو چکی ہے، دو دو تین تین سال بعد چند سطریں لکھی جاتی ہیں اور بس میرے خیال میں کل بقیہ کام بیس گھنٹوں کا ہوگا، لیکن وہ میسر نہیں آتے، بہرحال کاغذ بھی دو سال سے خریدا ہے، طباعت کا ارادہ بھی ہو گیا، شاید طباعت شروع ہونے کے بعد آپ کی دعاؤں سے توفیقِ تکمیل نصیب ہو جائے، قرآن کریم کے بعد حدیث کی کیوں ضرورت ہے؟ اور حدیث کے بعد فقہ کی کیوں ضرورت ہے؟ پہلے سے

تقریباً فارغ ہو چکا ہوں، اور دوسرا جزء باقی ہے، اس کے لیے کتاب ’’الفقیہ والمتفقہ ‘‘ خطیب کی ضرورت تھی، الحمد للہ وہ بھی طبع ہو کر آگئی ہے۔

حضرت شیخ امام العصر کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ: ’’قرآن معلق رہتا ہے جب تک حدیث کی طرف رجوع نہ کیا جائے، اور حدیث معلق رہتی ہے، جب تک فقہ کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔‘‘ اس کی شرح کرنی چاہیے، لیکن ذرا عنوان بدل دیا، وہ یہ ہے کہ: ’’قرآن کریم پر ایمان ممکن نہیں جب تک حدیث پر ایمان نہ لایا جائے، اور حدیث پر عمل ممکن نہیں جب تک فقہ پر عمل نہ کیا جائے، قرآن پر ایمان حدیث پر ایمان لانے پر موقوف ہے، اور حدیث پر عمل کے لیے فقہ کی ضرورت ہے۔‘‘ بس! جزء ثانی کی ضرورت ہے، اگر آپ کی دعائیں شامل حال ہوں تو ان شاء اللہ تعالیٰ! جلد کام شروع کرلوں گا، تفصیل نہ سہی اجمال بھی کافی ہوگا۔

مکتوبِ گرامی بینات میں منشأ کے خلاف شائع ہوگیا، اس کا افسوس ہے، آئندہ احتیاط کی جائے گی، یا بہت غور کیا جائے گا، اگر کوئی حصہ نشر کے قابل نہ ہو تو حذف کرکے شائع کیا جائے گا۔

اگر آپ کا ہندوستان جانا مقدر ہے تو ارادہ ہے کہ عزیزم محمد بنوری سلمہٗ آپ کے ہمرکاب برائے خدمت ہو جائیں، پاسپورٹ بنایا گیا، بقیہ کی تکمیل کی جارہی ہے، شاید یہ خادمانہ صحبت ورفاقت زندگی میں انقلاب وتغیر پیدا کردے، آمین! آپ بھی دعا فرمائیں کہ اس آرزو کے لیے یہ خدمت وصحبت میسر آجائے اور اس صحبت پر صحیح ثمرات مرتب ہوں:

جهـد الـمتيّـم أشـواق فيظهـرهـا　　　دمع علٰـى صـفـحـات الـخـد ينحدرُ

پاؤں میں آج کل تکلیف زیادہ ہے، اِدھر صحیح بخاری شریف (کے) ختم کی فکر ہے، اُدھر بسلسلہ قادیانیت‘ افریقہ کا ایک دورہ بہت ضروری ہے، اس کی تیاری ہورہی ہے، نیز رنگون ولندن کے سفر کا تقاضا شدید ہوتا جارہا ہے، ان سب کے لیے دعا فرمائیں، اگر خیر ہو تو مقدر ومیسر ہو اور توفیق نصیب ہو اور نافع ومثمر ہو۔

پاکستان کی حکومت کا رُخ غیر صحیح سمت میں جارہا ہے، سوشلزم کے خطرات لاحق ہیں، خصوصی دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ پاکستان کو صحیح اسلامی حکومت بنائے اور صحیح ثمرات مرتب فرمائے اور حکمرانوں کو صحیح فہم اور صحیح عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین! عریضہ طویل ہوگیا معافی چاہتا ہوں۔

والسلام

آپ کا محمد یوسف بنوری عفی عنہ

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

اسلام اور سیکولرزم

مفتی عبدالرؤف غزنوی
سابق استاذ: دارالعلوم دیوبند انڈیا، حال استاذ: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

(پہلی قسط)

زیرِ نظر تحقیقی مقالہ مفتی عبدالرؤف غزنوی مدظلہٗ نے ۳۰ جون ۱۹۹۱ء کو ''انجمن خدام القرآن وانمباڑی، انڈیا'' کی طرف سے منعقدہ اجتماع میں اس وقت پیش کیا تھا جب وہ دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمت انجام دے رہے تھے اور مذکورہ انجمن کی طرف سے ان کو مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ''اسلام اور سیکولرزم'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ مقالہ میں سیکولرزم کا تاریخی پسِ منظر، اس کا مفہوم ومقصد، اسلام کی روشنی میں اس کا تجزیہ اور سیکولر طرزِ حکومت میں مسلم اقلیت کے لیے لائحۂ عمل پیش کیا گیا ہے۔ افادیتِ عامہ کے پیشِ نظر قارئینِ ''بینات'' کی نذر کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

تمہید

تاریخِ انسانی پر ہم جب ایک غائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو بہت سے فاسد خیالات، لاتعداد نظریے اور زہریلے افکار کے آہن پوش لشکر ہمیں باہم برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، کہیں فرعونیت کا چرچا ہے تو کہیں قارونیت کے ڈنکے بج رہے ہیں، کسی جگہ قیصریت کا شہرہ ہے تو کہیں سے کسرائیت کی آوازیں آرہی ہیں۔

اگرچہ تاریخِ انسانی کے پورے سفر میں اسی اتھل پتھل اور شور شرابے کا ماحول گرم ہے، لیکن اُنیسویں صدی اس لحاظ سے کچھ زیادہ ہی اہمیت کی حامل ہے کہ ذہنی پراگندگی، فکری انتشار، سیاسی و مذہبی کشمکش اس صدی میں اپنے شباب کو پہنچ رہی ہے اور باطل جماعتوں نے پوری قوت سے عالمِ اسلام پر شب خون مارا ہے۔

ایک مؤرخ فکر وتدبر، ذہانت وفراست اور دور بینی کے ساتھ تاریخ کا جائزہ لے کر حالات کا صحیح موازنہ کرے تو یقیناً وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ یہ صدی اپنے باغیانہ افکار، ملحدانہ خیالات اور منافقانہ نظریات کی پرورش میں دیگر تمام صدیوں پر بازی لے گئی ہے۔

سرمایہ داری کا ظہور بھی اسی میں ہوا، تحریکِ الحاد بھی یہیں سے اُٹھی ہے اور دنیا میں عدل و مساوات کا پُرفریب نعرہ لگا کر انسانیت کا خون چوسنے والے اشتراکیت وکمیونزم جیسے ناپاک نظریے بھی اسی صدی کی پیداوار ہیں، لیکن اس صدی کا سب سے اہم نظریہ وہ فکر ہے جس کو دنیا آج سیکولرزم کے معروف نام سے جانتی ہے، یہ نام اگرچہ نیا نہیں پُرانا ہے اور دنیا کا بچہ بچہ پوری طرح اس سے واقف ہے، لیکن اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ اس تحریک کے پسِ منظر، اس کے اغراض و مقاصد اور اسی کے مزاج سے عوام تو کیا بعض دانشورانِ قوم بھی پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ اسی کے پیشِ نظر ہم نے اس مقالے میں جہاں اس نظریے کی پوری تاریخ قلم بند کی ہے، وہیں ایک آفاقی اور ہمہ گیر فکر کے تحت اپنی نگاہ کو کسی ایک خطہ کے بجائے پوری دنیا پر مرکوز رکھا ہے۔

اگر ہم ابتداء ہی میں سیکولرزم کے اس مفہوم پر بحث کرنے لگتے جو ہندوستان میں عموماً مراد لیا جاتا ہے تو اس مقالہ کی خانہ پوری تو ہو جاتی، لیکن جہاں اس عنوان کی وسعت کو صدمہ پہنچتا اس کی آفاقیت متاثر ہوتی، وہیں ہمارا یہ وسیع موضوع ہندوستان ہی میں سمٹ کر رہ جاتا اور اس کا پورا حق بھی ادا نہ ہو پاتا، اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے بغیر کسی خوف وجھجھک کے اس موضوع پر بہت بے باک ہو کر قلم اُٹھایا ہے اور اس کے ایک ایک پہلو، ایک ایک زاویہ کو اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ سامعین جہاں اس کی ماہیت سے واقف ہوں، اس کے ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں، وہیں ان تمام اسباب وعوامل کا بھی مطالعہ کرتے چلیں جو اس نظریے کی تخلیق کا باعث بنے ہیں، تو اس طرح یہ مقالہ ہمہ گیر پہلوؤں کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ کی ایسی مستند دستاویز بن گیا ہے جو ہر دور میں ان شاء اللہ تعالیٰ! تاریخ کے طالبِ علم کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

یہاں پر اس امر کی بھی وضاحت کر دیں کہ سیکولرزم پر بے لاگ تبصرہ کرنے اور اس کی متعدد توجیہات کا قرآن وسنت کی روشنی میں جائزہ لینے میں ہم نے ذرا سخت موقف اختیار کیا ہے (جس سے سامعین کو کچھ نہ کچھ غلط فہمی ہو سکتی ہے) لیکن لائحۂ عمل کے باب میں آکر یکا یک اپنی پوزیشن بدل دی ہے اور ایک وقتِ مقررہ تک ہم نے اس سے سمجھوتہ کر لیا ہے، کیونکہ موجودہ حالات میں مختلف مصلحتوں کے پیشِ نظر ہم بھی ہندوستان میں سیکولرزم ہی کو مفید سمجھتے ہیں۔

پہلا باب
سیکولرزم کا تاریخی پسِ منظر

رومی سلطنت نے اپنے آبائی مذہب بت پرستی کو چھوڑ کر ۳۰۵ عیسوی میں جب عیسائیت کو قبول کیا تو اس بے یارو مددگار مذہب کو اپنی شان وشوکت، رعب ودبدبہ قائم کرنے اور عالمگیر پیانے پر مذہبی اشاعت کا وہ موقع مل گیا جس کا وہ برسوں سے آرزومند تھا، ورنہ اس سے پہلے وہ محض بوریا نشین زاہدوں اور جنگل میں روپوش راہبوں کا ایسا مذہب تھا جو صرف فلسطین کی گلیوں تک محدود تھا، لیکن جب ایک بڑی طاقت نے اس پر دستِ شفقت رکھا تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح اُٹھا اور بحرالکاہل کے تمام ساحلی ملکوں کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا پورے یورپ پر چھا گیا اور اس کی اشاعت کے لیے سرکاری ذرائع ابلاغ اور مملکت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی تو اس طرح چھٹی صدی عیسوی تک مسیحیت نے نہ صرف یہ کہ یورپ میں اپنے قدم جما لیے، بلکہ کلیسائی نظام اور محکمۂ احتساب کا گھنا جال بچھا کر یورپی عوام کو پورے طور پر اپنی گرفت میں لے لیا، یہ وہ وقت تھا کہ جب یورپ اپنے خودساختہ فلسفوں، تاریک نظریوں اور کلیسائی نظام کی بنا پر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ علم وحکمت، صنعت وحرفت کی اس کو ہوا تک نہ لگی تھی! لیکن جب ساتویں صدی کے اوائل میں اسلام کا روشن آفتاب طلوع ہوا اور اس کی نورانی کرنیں عرب کے ریگزاروں سے نکل کر افریقہ اور یورپ تک پہنچیں تو وہاں کی فضاؤں سے وہ کُہر اچھٹنے لگا جو مسیحیت کی تاریک دنیا میں زمانۂ دراز سے چھایا ہوا تھا۔

آٹھویں صدی عیسویں میں جب عرب کے ان جیالے سپوتوں نے عیسائیت کو بیت المقدس سے بے دخل کر دیا اور بے خوف وخطر ایشیا وافریقہ کو روندتے ہوئے فرانس کی وادی پیریز تک جا پہنچے تو ان کی سانسوں کی آواز سن کر عیسائیت کا وہ قصر لرزنے لگا جو یورپ کو اپنی آبائی جاگیر سمجھ رہا تھا، نیز مسلمانوں کے پے در پے حملوں اور ان کی جرأت مندانہ پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے عیسائی دنیا یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر عربوں کی فتوحات کا یہی حال رہا تو مسیحیت کی تاریخ میں وہ دن ضرور آئے گا جب وہ کلیساؤں اور شہروں کو چھوڑ کر پہاڑوں اور ویرانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوگی۔ اس بھیانک انجام کو سوچ کر پادریوں کے بدن تھرّا گئے، دل ودماغ لرز اُٹھے، ان کی عقلیں جواب دینے لگیں، اور جب کچھ نہ بن پڑا تو جوروتشدّد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے دبے اور کچلے عوام کی عقل وفراست پر پہرے بٹھا دیئے اور ان تمام لوگوں کو مجرم قرار دیا جو علمی ضیاپاشیوں سے مستفید ہوکر کلیسائی نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے لگے تھے۔

یہ طریقہ اگرچہ ایک حد تک کامیاب رہا اور مسیحیت جزئی طور سے اپنا تخت وتاج بچانے میں کامیاب ہوگئی، لیکن سولہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے جب پاپاؤں کے ظلم وستم حدود سے تجاوز کرنے لگے تو سالہا سال سے پسے عوام کے صبر کا پیمانہ بالآخر لبریز ہوگیا اور ان ہی کے درمیان سے ملحدوں کی ایک بڑی اکثریت مذہب سے بغاوت کرتے ہوئے عیسائیت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ عمل چونکہ برسہا برس کی زیادتیوں کا نتیجہ تھا، اس لیے اس کے اندر اتنا غلو اور اتنی تیزی آتی گئی کہ مذہبی طبقہ گھبرا گیا، اُسے زمین تنگ اور آسمان گرتا ہوا محسوس ہوا، کیونکہ ملحدین ان خونخوار بھیڑیوں کو زندہ رہنے کا حق دینے کے لیے بھی تیار نہ تھے جنھوں نے مذہب کا سہارا لے کر صدیوں ان کے آباء واجداد کی رگوں سے لہُو نچوڑا تھا، اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ملحدوں نے باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کرکے نہ صرف یہ کہ عیسائیت کے خلاف مورچہ بندی شروع کردی، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں مذہب کو للکارتے ہوئے اس کے خلاف زبردست جنگ چھیڑ دی۔ میدان میں کیونکہ دونوں حریف ٹکر کے تھے اور کلیسا اتنا کمزور بھی نہ تھا کہ آسانی سے ہتھیار ڈال دیتا، چنانچہ اس نے اپنی قیادت کو بچانے کے لیے ہر ہر طریقہ اختیار کرتے ہوئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، لیکن اس کے باوجود ظالموں کا یہ تھکا ہوا ٹولہ اس تازہ دم طاقت کا مقابلہ نہ کرسکا جو مظلوموں کی آواز بن کر پورے یورپ میں گونج رہی تھی۔ عیسائیت آخر آخر تک معاشرہ پر اپنی بالادستی چاہتی تھی، جب کہ فریق مخالف اُسے زندہ رہنے کا حق دینے کا بھی روادار نہ تھا، اسی نقطے پر یہ دونوں تحریکیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے زمانۂ دراز تک گھمسان کی جنگ لڑتی رہیں، اور طویل قربانیوں کے بعد جنگ کو اس منزل پر لے ہی آئیں جس میں ایک کی فتح اور دوسرے کی ہار یقینی تھی، لیکن عین وقت جب کہ فیصلہ کن معرکہ گرم تھا، مسیحیت ملحدوں کے سامنے سپر ڈالنے کی تیاری کررہی تھی، اچانک ''جارج جیک ہولی اوک'' کی قیادت میں ایک منافق گروپ بیچ میں کود پڑا اور اس نے مذہب کو پرائیویٹ معاملہ قرار دینے کی آواز اُٹھا کر سالہا سال تک چلنے والی جنگ کی بساط ہی اُلٹ دی، یہی وہ نظریہ تھا جس کو آج ہم ''سیکولرزم'' کے معروف نام سے جانتے ہیں۔

تحریکِ الحاد اور عیسائیت دونوں کا سیکولرزم سے سمجھوتہ

تحریکِ الحاد چونکہ مذہب سے نفرت کے ساتھ ساتھ اسے ایسا شکنجہ بھی قرار دیتی تھی، جس سے انسان کو نجات دلانا اس کے نزدیک اولین فرض تھا، اسی لیے اُسے ان لوگوں کی حمایت حاصل نہ ہوسکی جو مذہب کے لیے ذرا بھی نرم گوشہ رکھتے تھے، جب کہ عیسائیت اپنے ظلم وستم، جور وتشدد اور زیادتیوں کی وجہ سے اس مذہبی طبقہ کی حمایت سے محروم رہی، اور سیکولرزم نے اپنی منافقانہ روش کی بنا پر نہ صرف

یہ کہ اکثریت کی تائید حاصل کر لی، بلکہ عیسائیت کو بھی مجبور ہو کر سیکولرزم سے سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ملحد تو یوں سیکولرزم کی پشت پناہی کرنے لگے کہ وہ حکومت وسلطنت اور اجتماعی طور سے مذہب کو معاشرہ سے نکالنے میں ان سے کامل طور پر اتفاق کرتے تھے، جب کہ عیسائیت اپنے خطرناک اور بھیانک انجام کو دیکھ رہی تھی کہ ملحدین کی جماعت عنقریب اُسے دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دے گی، اس لیے الحاد کے بالمقابل سیکولرزم جیسی تحریک اُسے بروقت نصرتِ خداوندی محسوس ہوئی جو انسانوں کو اجتماعی طور پر نہ سہی انفرادی طور پر تو کم از کم مذہبی رواداری کا حق دیتی ہے، اسی کو سوچ کر عیسائیت نے ملحدوں کو شکست دینے کے لیے اپنی بچی کھچی طاقت کا وزن سیکولرزم کے پلڑے میں رکھ دیا اور ہمیشہ ہمیش کے لیے اُسے قیادت کے منصب کو سونپ کر عیسائیت کو کلیسا تک محدود کر دیا۔

اس پسِ منظر کو سامنے رکھ کر ایک مؤرخ یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ میدانِ مبارزہ میں اگرچہ الحاد و کلیسا ہی برسرِ پیکار ہیں، لیکن میدان سیکولرزم کے ہاتھ رہا ہے۔

سیکولرزم پر ایک اجمالی نظر اور اس کا مفہوم

سیکولرزم دراصل یورپ کے ایک باشندے ''جارج جیکب ہولی اوک'' کے فاسد خیالات کا پلندہ اور اس کے گمراہ قیاس کا نتیجہ ہے، یہ شخص ۱۸۱۷ عیسوی میں برطانیہ کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوا، اس کے آباء واجداد مذہبی ہونے کی بنا پر کلیسا سے قریبی مراسم رکھتے تھے، اس لیے اس نے زمانۂ طفولیت سے ہی مذہبی لباس میں پوشیدہ کلیسائی درندوں کو غریب عوام کا خون چوستے اور مردوں کی ہڈیاں بھنبھوڑتے دیکھا تھا، پادریوں کے ان ہولناک مظالم کی بنا پر اس کا دل مذہب سے اتنا بیزار ہو گیا کہ ۱۸۴۱ء میں اس نے خدا کا انکار کرتے ہوئے عیسائیت سے کھلے عام بغاوت کر دی۔ معاشرہ پر چونکہ کلیسائی گرفت مضبوط تھی، اس لیے اس کی تحریک کو نہ صرف ناکامی کا سامنا ہوا، بلکہ اس جرم کی پاداش میں اس کو مختلف ایذائیں، طرح طرح کی سزائیں اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں، مگر وہ شخص طویل مشقتوں کے باوجود عیسائیت کی جانب لوٹ کر نہ آیا، جس کا دل بچپن ہی میں مسیحیت سے کھٹا ہو گیا تھا، لیکن ان تلخ تجربات کی بنا پر وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا کہ ملحدوں کی طرح وہ بھی اگر خدا و مذہب کا بالکلیہ انکار کرتا رہا تو جہاں وہ مذہبی لوگوں کی حمایت سے محروم رہے گا، وہیں پاپاؤں کا طبقہ اس کی راہ کا روڑا بن جائے گا اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہو گا، اس منزل پر آ کر اس نے نفاق کا چولا پہنا اور ۱۸۵۱ء میں سیکولرزم کی اصطلاح گھڑ کر مذہب والحاد کے درمیان ایسی راہ نکالی جو بظاہر تو مذہب سے بیزار نہ تھی، لیکن حقیقۃً مذہب کو مٹانے کے لیے

الحاد کی تمہید تھی اور اس کا فائدہ بالآخر تحریکِ الحاد کو پہنچنا تھا، کیونکہ مذہب کو جب پرائیویٹ زندگی میں محدود کر دیا جائے تو تاریخ میں وہ دن ضرور آئے گا جب مذہب پرائیویٹ زندگی سے بھی رختِ سفر باندھنے پر مجبور ہوگا:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اس طرح جہاں وہ تحریکِ الحاد کو ہمنوا بنانے میں کامیاب ہوا، وہیں مذہب کو پرائیویٹ زندگی میں جگہ دے کر ان پاپاؤں کے نزدیک بھی ہیرو بن گیا جو ملحدین کے حملوں کی تاب نہ لاکر شہرِ قیادت سے کوچ کرنے کی تیاری کر چکے تھے:

باغباں بھی خوش رہا راضی رہا صیاد بھی

اس سے پہلے کہ ہم مزید آگے بڑھتے ہوئے سیکولرزم کے ہر ہر پہلو کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیں، ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک نظر ان کلمات پر بھی ڈالتے چلیں جو سیکولرزم پر ایمان رکھنے والوں نے اس کی تعریف میں نقل کیے ہیں:

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کے مصنف سیکولرزم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Doctrine that the morality be non religious policy of excluding religious teaching from schools understate control." (سیکولر تعلیم اور علامہ اقبالؒ، ص:۱۱۵)

یعنی یہ اُصول کے اخلاق کی بنیاد غیر مذہبی ہو اور مملکت کی زیرِ نگرانی چلنے والے مدارس و یونیورسٹیوں سے مذہبی تعلیم کو خارج کر دینے کی پالیسی پر سیکولرزم کا اطلاق ہوتا ہے۔

پھر لفظ ''سیکولر'' کے معنی بیان کرتے ہوئے مصنف رقم طراز ہے:

"Concerned with affairs of this world."

(سیکولر تعلیم اور علامہ اقبالؒ، ص:۱۱۵)

''یعنی وہ نظریۂ حیات جس کا تعلق صرف اس دنیا کے معاملات سے ہو۔''

مزید آگے بڑھ کر وہ سیکولرزم کی اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"Secularism is the term appliedingene ralto separation ofstate politios or administration from religious or church

matter." (سیکولر تعلیم اور علامہ اقبالؒ، ص:۱۱۶)

یعنی مملکت کے نظم ونسق کو اگر بالکلیہ مذہب سے جدا کردیا جائے تو اس نظام کو سیکولرزم کہا جاتا ہے، جبکہ ''انسائیکلو پیڈیا'' میں سیکولر تعلیم کے متعلق یہ الفاظ درج ہیں:

"Secular education is a system of training from which definite religious education is excluded." (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، ج:۲۰،ص:۲۶۴)

یعنی سیکولر تعلیم وہ طریقۂ تربیت ہے جس سے مذہبی تعلیم خارج کردی گئی ہو۔

سیکولرزم کے پسِ منظر، اس کے بانی کا فکر وشعور اور اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریفوں کے پیشِ نظر ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ سیکولرزم کی عمارت مندرجہ ذیل چار ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے:

۱:- دیگر نظاموں اور متعدد ازموں کی طرح وہ بھی عقلِ انسانی کو معیار قرار دے کر محض اس مادی دنیا پر نگاہ رکھتا ہے، اور اجتماعی طور پر ایسا ماحول بنانے پر زور دیتا ہے جو انسانوں کی توجہ غیبی دنیا سے پھیر کر اس مشاہداتی دنیا پر مرکوز کردے۔

۲:- وہ اخلاقیات وسماجیات کو مذہب سے جدا کرکے لادینی بنانے کا متمنی ہے۔

۳:- مملکت وسلطنت اور سیاست سے مذہب کو دور رکھنا چاہتا ہے۔

۴:- طریقۂ تعلیم کو مکمل لادینی بنانے کا آرزومند ہے۔

سیکولرزم کی نقل کردہ تعریفوں سے یہ تو ہمارے اخذ کردہ اصول تھے، جبکہ اس نظریہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک ہندوستانی مفکر ''راجیو بھارگوا'' انگریزی جریدے (Frontline) میں اس کی مزید پانچ توجیہ نقل کرتا ہے:

۱:- حکومت محض نام کے اعتبار سے سیکولر ہو اور اس نظریہ کے مطابق تمام ملک میں پھیلے مذاہب کی سرپرستی کرکے اس مذہب کو غالب کرنے کی کوشش کرے جو ملک کی اکثریت کا مذہب ہو، لیکن اس کے ساتھ ہی اقلیت کے مذہب کا استحصال بھی نہ ہو۔

۲:- ہر مذہب کے فرقہ پرستوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور حکومت ان سب کو ایک پلیٹ فارم پر لاکر مصالحانہ رویہ کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔ پچھلے بیس برس سے ہندوستان سیکولرزم کی تقریباً اس شق پر عمل پیرا رہا ہے۔

۳:- سیکولرزم سے مراد وہ نظریہ ہے جس میں تمام مذاہب کا یکساں احترام ہو اور کسی کو دوسرے پر مذہبی حیثیت سے کوئی فوقیت نہ ہو، تمام لوگوں کو بلاتفریقِ مذہب وملت کے یکساں مواقع

حاصل ہوں۔

ہندوستان کے سیکولر دانشور سیکولرزم کی اس توجیہ کو مناسب پالیسی اور ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں، آزاد ہندوستان کی معمار شخصیت اور مدراس کے پہلے وزیراعلیٰ ''سی راج گوپال اچاریہ'' نے بھی سیکولرزم کی بابت تقریباً ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۴:-حکومت کے سیکولر ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ غیر مذہبی تو ہو، مگر مذہب کی مخالف نہ ہو، اس نظریہ کے حامی لوگ عقلِ انسانی کے محدود ہونے اور معاشرتی احتیاج کے پیشِ نظر مذہبی اعتقاد و شعائر کے حامل تو ہوتے ہیں، لیکن وہ مذہب کو حکومت پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے، بلکہ اس کو بالکلیہ لادینی دیکھنا چاہتے ہیں۔

۵:- پانچویں توجیہ نقل کرتے ہوئے مصنف سیکولرزم کے چہرے سے نقاب ہٹا کر اس کے اصول و مبادی، مزاج و مقاصد اور اس کے دعویداروں کی پوری تصویر اس شق میں سمیٹ لیتا ہے اور کھل کر یہ کہتا ہے کہ سیکولرزم کے معنی ''لادینیت'' ہے اور اس کے حامی صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو خود کو روشن خیال تصور کر کے جہاں حکومت کو مذہب کے تئیں معاندانہ رویہ پر اُکساتے ہیں، وہیں اس کو تمام جھگڑوں کی بنیاد بتا کر ایک طرح کا ڈھکوسلہ قرار دیتے ہیں۔

یہ تو ''راجیو بھارگوا'' کے اپنے خیالات تھے، جب کہ جامعہ ملیہ کے مشہور مؤرخ اور عظیم دانشور پروفیسر ''مجیب'' اپنی کتاب ''ہندوستانی سماج پر اسلامی نقوش'' میں سیکولرزم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: سیکولرزم اس اعتقاد اور ایقان کو کہتے ہیں کہ ہم ساری توجہات اس مادی دنیا پر مرکوز کردیں۔

یہاں پہنچ کر ہم ان چار اُمور کی قدرے وضاحت کرنا چاہتے ہیں جو سیکولرزم کے بنیادی اصول کہے جاسکتے ہیں، جبکہ مندرجہ بالا توجیہات پر مقالہ کے دوسرے باب میں ہم تفصیل سے کلام کریں گے۔

دنیا پرستی و عقل پرستی

عیسائیت اپنے مزعومہ خیالات اور فرسودہ عقائد کی بنا پر عقل اور جدید علوم کی شدید دشمن ہے، کیونکہ عقل کو معیار تسلیم کر لینے کے بعد کلیسائی نظام کی پوری عمارت اپنے لاؤلشکر کے ساتھ زمین پر آگرتی ہے، اس لیے مسیحیت نے عقل کو مطعون و ملعون ٹھہرا کر ہر دور میں اسے محبوس کرنے کی انتھک کوشش کی ہے، جب کہ تحریکِ الحاد اس کی مخالف سمت کی پیروی کرتے ہوئے عقل کو اپنا امام قرار دیتی

ہے۔ سیکولرزم جو مکمل غیر جانبداری کا دعویٰ کرتا ہے، یہاں مذہب کی راہ چھوڑ کر الحاد کی پیروی کرتے ہوئے نہ صرف عقل کو اپنے سر کا تاج بنا رہا ہے، بلکہ انسانی عقل کو عیوب ونقائص سے مبرّا قرار دے کر حسن وقبح کا معیار بتاتا ہے، اس کے نزدیک انسانی عقل اتنی صلاحیت ولیاقت رکھتی ہے کہ وہ حقیقت کے ساتھ ساتھ کائنات کے تمام اسرار ورموز کا مکمل طور سے ادراک کرسکتی ہے۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسانی توجہات کا مرکز اور اس کی محنت ولیاقت کی تماشا گاہ صرف یہ دنیا ہونی چاہیے اور اس کی دنیاوی ترقی کے لیے تمام مادی وسائل کی افادیت ومضرت صرف عقل ہی سے جانی جاسکتی ہے، نیز وہ دلی طور سے اس بات کا بھی متمنی ہے کہ انسان اپنی صلاحیتیں اُس دنیا پر نہ لگائے جس کے وجود کو سیکولرزم تسلیم نہیں کرتا، اگر کبھی بادلِ ناخواستہ اس کے وجود کو ماننے پر آمادہ ہوتا ہے تو وہاں بھی یہ تصریح کرنے سے باز نہیں رہتا کہ اُس دنیا کا انسانی فلاح وبہبود اور اس کی خوشحالی سے کوئی تعلق نہیں، تو اس طرح وہ انسانیت کو ظواہر کی پرستش کرنے اور لاشعوری طور پر اُمورِ غیبیہ کا انکار کرنے کی ترغیب دے رہا ہے، کیونکہ وہ صرف اِس مشاہداتی دنیا پر نظر رکھتا ہے۔

اجتماعی معاملات ومعاشرہ کو لادینی بنانے کی کوشش

سیکولرزم دینی طبقہ کو مذہبی آزادی تو دیتا ہے، لیکن وہ اس آزادی کو دل کے نہاں خانوں اور عبادت گھروں کی چہار دیواری کے اندر اندر ہی دیکھنا چاہتا ہے اور جہاں اس آزادی نے انفرادیت سے نکل کر اجتماعی معاشرہ میں قدم رکھا، وہیں سیکولرزم کا مزاج برہم ہوجاتا ہے، کیونکہ وہ انسانوں کو اخلاقی، سماجی اور معاشرتی طور پر لادینی بنانے کا آرزومند ہے، اس لیے ہر دور میں اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان عقائد واعمال کی ان تمام دیواروں کو توڑ دے جو ان کے حاملین کے درمیان امتیازات وتشخُّصات کے خطوط کھینچتی ہیں، نیز وہ ایسی طرزِ معاشرت، مخصوص لباس اور ان تمام علامتوں کا استحصال کرتا ہے جن کے ذریعے ایک مذہبی فرقہ دوسرے فرقوں سے الگ اور ممتاز ہونا چاہتا ہے، سیکولرزم جہاں قوموں کی تشکیل عقائد سے ہٹ کر وطن کی بنیاد پر کرتا ہے، وہیں ایک ملک میں رہنے والے تمام حاملینِ مذہب کو ایک دوسرے کے قومی تہواروں، تاریخی میلوں اور عبادتی رسوم میں شریک ہونے کی دعوت دے کر ملی جلی تہذیب اور مشترکہ ثقافت بنانے پر زور دیتا ہے۔

مذہب کو اقتدار وسیاست سے دور رکھنے کا عزم

سیکولرزم کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومت کو لادینی بنانے کے ساتھ ساتھ مذہب وسیاست کے درمیان ایک آہنی دیوار کھڑی کردی جائے اور دین کو پرائیویٹ زندگی میں محدود کرکے

جہاں وہ حکومت کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہو، وہیں اسٹیٹ میں عوام کو ایسا معاشرہ بنانے پر بھی مجبور کردے جس کا فرد ذاتی ونجی طور پر تو بھلے ہی مذہبی ہو، لیکن اجتماعی اور معاشرتی طور پر اس قید و بند سے آزاد ہو، کیونکہ وہ افراد کو حکومت میں محض وطن اور قوم کی بنیاد پر شریک کرتا ہے، مذہبی حیثیت سے اُنھیں کوئی حصہ نہیں دیتا، اس لیے وہ سرکاری اور حکومتی سطح پر مذہب پسندوں کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، وہ مذہب کو سیاست سے جدا کرنے کے ساتھ ساتھ اُسے چند خوش عقیدہ لوگوں کا نجی معاملہ قرار دے کر مواعظِ حسنہ یا اخلاقی ضابطہ کے طور پر برداشت تو کرتا ہے، لیکن اس کی دلی خواہش یہ ہے کہ ملک کی تمام مذہبی اشخاص چھپ چھپا کر خاموشی کے ساتھ پوجا پاٹ تو کرلیں، لیکن جب وہ عبادت خانوں سے باہر نکلیں تو مذہب کا چولہ اور دینی رنگ وہیں اُتار دیں، اور معاشرہ میں صرف ایک مذہب سے بے نیاز انسان کی طرح داخل ہوں۔

سیکولرزم مذہب کو ذاتی وانفرادی زندگی میں محدود کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی تصریح کرتا ہے کہ عبادت کو چھوڑ کر بقیہ دنیاوی و سیاسی اُمور کا نہ صرف یہ کہ مذہب سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ انسان ان اُمور میں فطری طور پر بالکل آزاد ہے، وہ تجربات وعقل کی روشنی میں جیسا چاہے قانون بنائے، نیز طرزِ معاشرت، رہن سہن، عادات واخلاق، اقتصادیات ومعاش اور دیگر تمام اُمور میں مذہب سے الگ راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

لادینی طریقۂ تعلیم

سیکولرزم کی تعریف کرتے ہوئے ہم ''انسائیکلو پیڈیا'' کے حوالے سے پیچھے نقل کرآئے ہیں کہ سیکولر تعلیم وہ طریقۂ تربیت ہے جس سے تمام مذہبی عناصر اور روحانی اثرات کو علیحدہ کردیا گیا ہو، مظاہرِ فطرت، آثارِ کائنات اور واقعات وکوائف کا مطالعہ بے لاگ ہوکر کیا جائے اور محققانہ طور پر حقیقت کا متلاشی بن کر کائنات میں چھپے ان تمام اسرار ورموز کا پتہ لگایا جائے جو اس مادی زندگی میں مفید ہوسکتے ہیں، تو دوسرے الفاظ میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انکشافِ حقائق میں مذہبی رجحانات کو خارج کردینے کا نام ہی سیکولر تعلیم ہے، اگرچہ معروضی طریقۂ تعلیم بھی یہی ہے کہ تمام داخلی وخارجی اثرات سے آزاد ہوکر کائنات کا مطالعہ کیا جائے، لیکن یہ طریقہ ہر قسم کے اثرات کو علیحدہ کرنے کی بات کرتا ہے، جب کہ سیکولرزم دیگر تمام اثرات کو تو بہ خوشی گلے لگاتا ہے، لیکن مذہبی میلانات' طریقۂ تعلیم میں اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔

(جاری ہے)

فقہ اور اُصولِ فقہ کی تدریس!

مفتی رفیق احمد بالاکوٹی
اُستاذ ونگران شعبہ تخصص فقہِ اسلامی جامعہ

مسالکِ اربعہ میں ائمہ کے اختلاف کے بنیادی اجتہادی اُصول

(تیسری اور آخری قسط)

اہم فائدہ

چلتے چلتے ایک لفظی تسامح کی نشاندہی کرتے چلیں کہ بعض حضرات فقہ اسلامی کی عصری تطبیق اور تصویرِ مسئلہ کی خارجی تمثیل کو جدید مسائل کا نام دیتے ہوئے خود رائی اور اجتہادِ جدید کی طرف لپکنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ اب تک جدید کہے جانے والے تقریباً تمام مسائل کا حل فقہی فروع یا اُصول وقواعد کی صورت میں ہی بتایا گیا ہے، اس بابت یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسائل یا احکام نئے نہیں ہوتے، بلکہ ان کی صورتیں نئی ہوتی ہیں، فقہاء زمانہ کا کام ہوتا ہے جدید صورتوں کی قدیم فقہ کے ساتھ تطبیق کرنا، قدیم فقہاء کے اجتہادات کی بدولت فقہ ابداعی، تطبیقی اور تقدیری ہمارے سامنے آچکی ہے۔

ہمارا اجتہاد ان کے اجتہاد سے پائیدار نہیں ہوسکتا، اس لیے بلاوجہ فقہ قدیم سے جدید مسائل کے نام پر عدول کرنا نامعقول امر ہے۔ ہاں! اگر ایسی صورت پیش آجائے جس کا فقہ قدیم کے ذخیرہ میں نصاً، اصولاً، فرعاً، اثباتاً یا نفیاً کوئی حل نہ ملتا ہو تو اس کے حل کے لیے فقہاء امت کے وضع کردہ اُصولوں کی روشنی میں متدین ومتعبد علماء کی مجلسِ مشاورت منعقد کی جائے گی اور وہ مجلس ایسی مشکلات میں اُمت کی دینی رہنمائی کرے گی۔ ایسے مسائل ان کے حل کے لیے رہنما اصول اور اجتہاد کے اصول وشرائط سے متعلق حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے چند گراں قدر مقالات جو فتاویٰ بینات کے شروع میں مقدمہ کے طور پر شامل ہیں، ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

بعض جدت پسندوں کو یہ بھی خبط ہوتا ہے کہ قدیم فقہ فقہاء کے اپنے زمانے کے احوال و مسائل کے حل کے لیے اجتہادی کوششیں تھیں، اب زمانہ بدل گیا ہے، زمانے کے حالات تبدیل ہو چکے ہیں، لہٰذا پرانی فقہ اس زمانے کے لیے کارآمد نہیں ہوسکتی، بلکہ اس میں تبدیلی ناگزیر ہے، اس فکر کو خبط

کہنا ہی کافی ہے، کیونکہ اس فکر کے حامل لوگ فقہ کی حقیقت سے ناواقف ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ فقہی احکام چار قسم کے ہوتے ہیں:

۱:-احکام منصوصہ اتفاقیہ ۲:-احکامِ اجتہادیہ اتفاقیہ

۳:-احکامِ اجتہادیہ خلافیہ ۴:-احکامِ جدیدہ غیر مصرحہ نفیاً و اثباتاً

پہلی دو قسموں میں زمانہ کی تبدیلی کا کوئی بھی اثر قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ تیسری قسم میں قدیم مجتہدین کے اجتہاد سے باہر نکلنے کی حاجت ہے، نہ اجازت ہے۔ اگر اجتہاد ہوسکتا ہے تو چوتھی قسم میں ہوگا، اس کی ضرورت کا کسی کو انکار نہیں۔ اسی طرح وہ مسائلِ اجتہادیہ عرفیہ جن کی بنا عرف وعادت پر رکھی گئی تھی، ایسے مسائل میں تغیرِ زمانہ کی وجہ سے تغیرِ حکم کی حقیقت قابل تسلیم ہے، ایسے مسائل میں از سرِنو غور وفکر ہوسکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے، مگر اس آخری قسم کے اجتہاد کی ضرورت باور کرانے کے ساتھ ساتھ مجتہدین کی اہلیت اور مطلوبہ شرائط کا سوال بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ معاملہ ہو دین کا اور اجتہاد کی اجازت دین بیزار مانگ رہا ہو تو اسے خبط کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟!

بہرکیف! حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ایسے قابلِ اجتہاد مسائل کے حل کے لیے انفرادی وشخصی کاوشوں کی بجائے ''**لجنة الاجتهاد**'' قائم کی جائے، جس کے ارکان میں کم از کم یہ پانچ اوصاف بدرجۂ تمام پائے جاتے ہوں:

۱:-اخلاص ۲:-تقویٰ ۳:-قرآن وسنت وفقہِ اسلامی میں مہارت و وسعت

۴:-دقتِ نظر و ذکاوت ۵:-جدید مشکلات کے سمجھنے کی اہلیت

جسے اجتہادِ جدید کا شوق ہو یا وہ اُمت کا درد رکھتا ہو تو ان شرائط سے آراستہ ہوکر ''**لجنة الاجتهاد**'' کا رکن بنے، اور چوتھی قسم کے مسائلِ جدیدہ کے حل میں ضرور مساہمت اختیار کرے۔ اگر اجتہادِ جدید کا کوئی شائق اس سے آگے لپکنے کی کوشش کرے گا تو اسے دین کے ساتھ مزاحمت سمجھا جائے گا، اور اس کی مزاحمت کرنا علماءِ دین کا فریضہ شمار ہوگا۔

فقہی احکام کی بناء علتوں پر ہوتی ہے، حکمتوں پر نہیں، مگر کسی نہ کسی حد تک حکمتوں پر نظر ہونا بھی ضروری ہے، مثلاً: قیاسِ شرعی اور استحسان کے تقابل کی صورت میں علتِ جامعہ کا تقاضا یہ ہوگا کہ قیاس کی رعایت کی جائے، مگر حکمت ومصلحت، متقاضی ہوگی کہ قیاسِ ظاہر سے عدول کرلیا جائے، حکمت کی اسی رعایت اور ترجیح کا دوسرا نام استحسان ہے۔ استحسان فقہاء کے ہاں فقہ کا ذیلی ماخذ بھی شمار ہوتا ہے، بظاہر اصل ماخذ کے مقابلے میں ذیلی ماخذ کی طرف التفات' قوی کے مقابلے میں ضعیف کی طرف التفات ہے، مگر حکمت ومصلحت اس کی مرجح بنتی ہے۔ اس حکمت کی رعایت بھی فقہاء کے ہاں اصل کا

درجہ رکھتی ہے، اس لیے فقہی مدرسین کو اپنے مطالعہ کے دوران فقہی احکام کے ماخذ، اصول اور علتوں کے ادراک کے ساتھ ساتھ حکمتوں پر اطلاع کی کوشش بھی کرنی چاہیے، اس موضوع پر سب سے عمدہ کتاب حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے، علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ''**الموافقات**'' کا ''**جزء المقاصد**'' بھی مفید ہے۔

اسی طرح حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''**المصالح العقلية فی الأحكام الشرعية**'' (احکامِ اسلام عقل کی نظر میں) بھی قابلِ استفادہ کتاب ہے، ان کتابوں کے مطالعہ میں رہنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہمیں اور ہمارے طالب علم کو شرعی احکام کی معقولیت کا ادراک ہوگا، اور عقل پرست طبقے کے زیغ وضلال سے محفوظ رہ سکیں گے۔

تدریسِ اصولِ فقہ

اس موضوع پر تین جہات سے بات ہوگی:

۱:-تمہید وتوطیہ ۲:-توضیح وتطبیق ۳:-تفریع وتذییل

تمہید

اس عنوان کے تحت اُصولِ فقہ کے مبادیات کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے گا، جس میں اصولِ فقہ کا تعارف، تدوین، تاریخ، تقسیم وتنویع اور اس فن کے وہ متعلقات جو عموماً درسیات سے دور رہتے ہیں۔ تمہید کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ مقصود وممہّد سے زیادہ طویل نہ ہو، مختصر ہی بتایا جائے۔

تعارف

اُصولِ فقہ کی تعریف کی متعدد تعبیرات میں سے آسان تعبیر یہ ہے کہ یہ علم فقہ تک رسائی دینے والے قواعد کی پہچان کا نام ہے۔ شرعی دلائل سے فقہی احکام کے استنباط واستخراج کا ملکہ فراہم کرنے والے قواعد کو اُصولِ فقہ کہا جاتا ہے۔ (کشاف اصطلاحات الفنون، ج:۱،ص:۲۸، ط: سہیل اکیڈمی لاہور)

اصل کا معنی دلیل، مرجع اور قاعدہ سے بھی کیا جاتا ہے۔ ان تمام اُمور کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُصولِ فقہ ان بنیادوں کا نام ہے جن پر فقہ اسلامی کی عمارت کھڑی کی گئی ہے، یا ان قواعد و طرق کا نام ہے جن کے ذریعہ دلائل شرعیہ سے فقہی مسائل کا استنباط واستخراج ہوا ہے۔

فقہی مسائل کے استنباط واستخراج کے اس عمل کے بارے میں اطلاع پانے سے پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ فقہاء امت نے فقہی مسائل کو جس دقتِ نظری اور نکتہ رسی سے مرتب کیا ہے، یہ ان کا احسانِ عظیم ہے، اور یہ کہ ان کی مشقتوں کو دیکھ کر فقہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جائے، دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ اگر

کوئی اجتہادی شان کا حامل ہو اور وہ دلائل سے مسائل کا استنباط کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ راستہ متعین ہے، مجتہدِ زمانہ کم از کم سابقہ مجتہدین کے اجتہادات کی بنیادوں سے شروع ہوکر چوٹیوں تک پہنچنے کی کوشش کرے، پھر اگر سابقہ اجتہادات پر اضافہ کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو وہ اپنی خدمات پیش کرے، اُمت اسے بھی اعتماد سے نوازے گی۔

اُصولِ فقہ کی تاریخ

اُصولِ فقہ جب ان بنیادوں کا نام ہے جن پر فقہی احکام کی تخریج ہوئی ہے۔ تو اس تعریف سے یہ فائدہ معلوم ہوتا ہے کہ اُصولِ فقہ کی تاریخ فقہ سے مقدم ہے، جس دور سے فقہ کی تاریخ بتائی جائے گی اس سے کچھ پہلے یا کم از کم اس کے ساتھ ہی اُصولِ فقہ کا آغاز بھی ماننا اور بتانا پڑے گا۔ فقہ کا وجود اُصولِ فقہ کے وجود کو مستلزم ہے۔

چنانچہ فقہ اسلامی کی تاریخی تشکیل سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کا وجود اور آغاز خود صاحبِ شریعت ﷺ کے دور سے چلا آرہا ہے۔ اس وقت اُصولِ فقہ کی صورت کیا تھی؟ اُصولِ فقہ کے مفہوم سے بے خبر کے لیے یہ سوال بڑا اہم ہے، مگر اُصولِ فقہ کا مفہوم جاننے والوں کے لیے کوئی بھاری نہیں ہے، کیونکہ وہ دور، شریعت کے نزول کا دور تھا، کسی بھی موقع اور مسئلہ میں بیانِ حکم کے لیے دو اصول کے ذریعہ حکم دریافت کرنا آپ ﷺ کا معمول تھا: ایک بذریعہ وحی، دوسرا بذریعہ اجتہاد۔

آپ ﷺ کے دورِ اطہر میں جو جو مسائل پیش آئے ان کا حل آپ ﷺ نے ان ہی دو ذریعوں سے پیش فرمایا، گویا آپ ﷺ کے زمانے میں علمی احکام (فقہی مسائل) کے اخذ واظہار کے یہ دو اصول تھے، انہیں زمانۂ نبوت کے فقہی اصول سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

آپ ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اجتہاد کا راستہ باقی رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی اجتہادی اصول کے ذریعہ منصوص مسائل کی روشنی میں غیرمنصوص مسائل کا استنباط و استنتاج فرمایا اور آگے چل کر اس سنت کو اپناتے ہوئے ائمہ مجتہدین نے سلسلۂ اجتہاد کو ضرورتِ مسائل کی بنیاد پر وسعت دی اور اس میدان میں نمایاں نام و مقام امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا۔ اس لیے انہوں نے منصوص سے غیرمنصوص کے استنباط واستنتاج کے اصول وفروع متعارف کرائے، پھر ان کی عیال داری میں یہ سلسلہ دینِ اسلام کی چارگانہ تعبیر بن گیا، بایں معنی اصطلاحی وعرفی فقہ اور اصول فقہ کے بانی و مدونِ اول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہی ہیں۔ (ابوالوفاء الافغانی، مقدمہ اصول السرخسی، ج:۱، ص:۳، دارالکتب العلمیۃ) پھر آپ کی تبعیت میں امام ابویوسف یعقوبؒ، امام محمد بن حسن الشیبانیؒ یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں سے کسی کے بارے میں اولیت کا قول کیا جائے تو امرِ اضافی کے طور پر وہ بھی درست

ہے، البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الرسالة'' کو اُصولِ فقہ کی کتاب قرار دینے کی صورت میں انہیں اُصولِ فقہ کی تدوین کی بجائے متداول تالیف میں اسبقیت کا اعزاز حاصل رہے گا۔ تدوینِ اُصولِ فقہ کے موضوع پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تدوینِ فقہ واُصولِ فقہ'' بہترین ذخیرہ ہے۔

اُصولِ فقہ کے مناہج اور اہم کتبِ مناہج

● اُصولِ فقہ پر باقاعدہ منظّم منہجی طریقے سے جو کام ہوا وہ چوتھی، پانچویں اور چھٹی ہجری میں ہوا، اس کے بعد کا جو کام ہے وہ تقریباً تعبیرِ جدید وتفنُّن فی العبارۃ یا جمع فی الطرق کا درجہ رکھتا ہے، ان ادوار میں اُصولِ فقہ کی تدوین کے تین مناہج متعارف ہوئے:

۱:- منہج المتکلمین / الشافعیہ ۲:- منہج الفقہاء/ الحنفیۃ

۳:- منہج المتاخرین الجامع بین الطریقین

● متکلمین کے طریق کو شافعیہ ومالکیہ کا طریق بھی کہا جاتا ہے، اس طبقہ والے صرف قواعد ذکر کرتے ہیں، قواعد کا دائرہ کار اور دلائل تک جاتے ہیں، جزئیات کی تطبیق کا التزام نہیں کرتے، جیسے امام الحرمین جوینیؒ کی ''البرهان في أصول الفقه'' (عبدالملک بن عبداللہ بن یوسف بن محمد الجوینی الملقب بامام الحرمین [۴۱۹ھ-۴۷۸ھ]) اور امام غزالیؒ کی ''المستصفٰی'' (ابوحامد محمد بن محمد الغزالی الطّوسیؒ) وغیرہ۔ قاضی عبدالجبار المعتزلی کی ''العمد''، ابوالحسین بصری معتزلی کی ''المعتمد'' (المعتمد في أصول الفقه، محمد بن علی الطیب ابوالحسین البصری المعتزلی [متوفی: ۴۳۶ھ]) بھی اسی منہج کی کتابیں شمار ہوتی ہیں، پھر ان کتابوں کے اسالیب کو امام رازیؒ [متوفی: ۶۰۶ھ] نے ''المحصول في علم الأصول'' میں اور علامہ آمدیؒ نے ''الإحكام في أصول الأحكام'' (ابوالحسن سیدالدین علی بن ابی علی بن محمد بن سالم الثعلبی الآمدی [متوفی: ۶۳۱ھ]) میں جمع فرمایا ہے۔

● فقہائے حنفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے ائمہ کے اجتہادی مسائل کو سامنے رکھ کر اُصول وقواعد مرتب کرتے ہیں، قواعد کے ساتھ ہی تفریع کے لیے جزئیات ذکر کرتے ہیں، جس سے حنفی اُصولِ فقہ، اصول وجزئیات میں ارتباط اور تطبیق کا مظہر بن جاتی ہے، اور محض نظری کی بجائے تطبیقی اُصولِ فقہ بن جاتی ہے۔

حنفی طریق پر تالیف شدہ کتابوں میں دبوسی کی ''تقويم الأدلة'' (تقويم الأدلة في أصول الفقه، ابوزید عبیداللہ بن عمر بن عیسی الدبوسی الحنفی [متوفی: ۴۳۰ھ]) اور ''تاسیس النظر'' معروف ہیں، اس کے علاوہ ابومنصور ماتریدیؒ کی ''ماخذ الشريعة'' اسی دور کی تالیف ہے۔

اس فن کی سب سے عمدہ کتاب امام ابوبکر جصاص کی ''الفصول في الأصول'' (احمد بن علی

ابوبکر الرازی الجصاص الحنفی [متوفی: ۳۷۰ھ] ہے، أصول البزدوي (للامام فخر الاسلام ابی الحسن علی بن محمد بن حسین البزدوی [۴۰۰-۴۸۲ھ]) اور أصول السرخسي بھی ہے۔ أصول البزدوي کی جامع شرح ''كشف الأسرار ''للعلامہ عبدالعزا البخاری ہے (كشف الأسرار شرح أصول البزدوي ، عبدالعزیز بن احمد بن محمد علاء الدین البخاری الحنفی [متوفی: ۷۳۰ھ])، اُصولِ سرخسی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، اس کتاب کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کی سنت کی بحث حنفی اُصولِ حدیث کی جامع تقریر کا درجہ رکھتی ہے۔

● منہج المتاخرین جو جامع بین الطریقین کہلاتا ہے، اس طرز پر امام احمد بن علی البغدادی الحنفی الشہیر بابن ساعاتی [متوفی: ۶۹۴ھ] کی ''بديع النظام الجامع بين كتابى البزدوي والإحكام ''، صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود کی ''تنقيح الأصول ''اور اسی کی شرح ''التوضيح فى حل غوامض التنقيح ''اسی پر تفتازانی کا حاشیہ ہے: ''التلويح ''کے نام سے، یہی مجموعہ درسِ نظامی کا حصہ ہے'' شرح التلويح على التوضيح لمتن التنقيح ''کے نام سے۔اسی طرح علامہ سبکی رحمۃ اللہ علیہ کی [متوفی: ۷۷۱ھ] ''جمع الجوامع ''ہے، ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ [متوفی: ۸۶۱ھ] کی ''التحرير فى أصول الفقه ''ہے، جس کی شرح ابن امیر حاج [متوفی: ۸۷۹ھ] نے ''التقرير والتحبيرفى شرح كتاب التحرير ''کے نام سے لکھی، علامہ زاہد الکوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں ''التحرير ''اور ''التقرير ''کا تذکرہ بڑی اہمیت کے ساتھ ملتا ہے۔ ''مسلم الثبوت ''(محبّ اللہ بن عبدالشکور البھاری الہندی) بھی اسی ڈگر کی کتاب ہے، جس میں علامہ سبکی اور محقق ابن ہمام رحمہما اللہ کے ذکرکردہ اصولی مباحث کی تلخیص اور ترتیب نو فرمائی گئی ہے۔ ''فواتح الرحموت ''(عبدالعلی محمد بن نظام الدین الانصاری الہندی) کے نام سے اس کی معروف شرح ہے، اور ''مسلم الثبوت ''کے ہیبت ناک رعب و رھب کو آسانی سے دور کرنے کے لیے ایک آسان ترین شرح ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد انور البدخشانی مدظلہم نے ''إزالة الرهبوت عن مشكلات مسلم الثبوت ''کے نام سے لکھی ہے۔

اسی موضوع پر محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ الشوکانی رحمۃ اللہ علیہ [متوفی: ۱۲۵۰ھ] نے ''إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول ''کے نام سے کتاب لکھی، نواب صدیق حسن خانؒ [متوفی: ۱۳۰۷ھ] نے ''حصول المأمول من علم الأصول ''کے نام سے علامہ شوکانیؒ کی کتاب کی تلخیص کی ہے۔ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کی اس کتاب کے حوالہ جات علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں میں اور دیگر کئی باحثین کی ابحاث میں ملتے ہیں، گویا کہ اس کتاب سے ہمارے ہاں خوب استفادہ کیا گیا ہے، البتہ علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خاص مزاج ہے، اور اس گہرے موضوع میں کہیں کہیں وہ اپنی روایتی ظاہر بینی کا

اظہار فرما جاتے ہیں، مگر مجموعی لحاظ سے یہ کتاب اصولی مباحث کا مکمل احاطہ کرتی ہے، فقہاء کے اختلاف کو کما حقہ نقل کرتی ہے، عبارت وتعبیرات عام فہم، سادہ، مختصر اور واضح ہیں، اس موضوع کی دیگر کتب کی طرح تعقیدات واغلاقات سے پاک ہے۔ علامہ کے خاص مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ کتاب متاخرین اصولیین کے منہج کو سمجھنے کے لیے کافی شافی ہے۔

اُصولِ فقہ کے مباحثِ خمسہ

اُصولِ فقہ کے مباحث کو حصر اور ضبط میں لانے کے لیے پانچ بنیادی مباحث اور ان مباحث کے مدلولات سے قدرے واقفیت بھی ہونی چاہیے، ان مباحث کی طرف فقہ کے تعارف میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، وہ مباحث یہ ہیں:

۱:- حاکم ۲:- حکم ۳:- ادلۃ الاحکام ۴:- مقاصد ومدارجِ احکام ۵:- دلالۃ الکلام

حاکم

حاکم کا مطلب حکم دینے کی اتھارٹی یا تحلیل وتحریم کا فیصلہ کرنے کا مختار ومجاز کون ہے؟ یہ مسئلہ فقہ سے زیادہ علم کلام کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ ’’أَلاَ لَہُ الْحُکْمُ‘‘ (الانعام:۶۲) ’’إِنِ الْحُکْمُ إِلَّا لِلّٰہِ‘‘ (یوسف:۶۷) یعنی کسی فعل کا حکم متعین کرنا اللہ تعالیٰ کا ہی کام ہے، کسی اور ہستی یا عقل کا اس میں کوئی دخل نہیں مانا جاسکتا۔ شرعی احکام میں عقل کو حکم/ حاکم سمجھنے والے طبقے کا تعلق اہلِ اعتزال سے تو ہوسکتا ہے، مگر اہلِ سنت سے نہیں ہوسکتا۔ اُصولِ فقہ کے باحثین اور مدرسین کو دورانِ درس یا قبل از درس اس بحث کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ گمراہی کی بیشتر نالیاں عقل پرستی کے بحرِ مردار سے ہی نکلتی ہیں۔

حکم

حکم کی حیثیت کیا ہے؟ متعلقہ وصف کے ذریعہ اس کی نشاندہی کی جائے، یعنی فرض، واجب، سنت، حلال، حرام، مباح ومکروہ، جائز وناجائز وغیرہ جو حکم کے القاب ہیں، ان سے واقفیت ہونی چاہیے، کیونکہ مطلق امر وجوب سے لے کر اباحت تک مختلف مطالبات کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح نہی کا صیغہ حرام سے لے کر مکروہِ تنزیہی تک استعمال ہوتا ہے۔ جن فقہی احکام کے ہم اُصول پڑھنے جارہے ہیں، ان اُصول میں احکام کی یہ تفصیل اگر صحیح طور پر نہ سمجھی جائے تو کسی مسئلہ کا حکم متعین کرنے میں غلطی سے حفاظت نہیں ہوسکے گی، اگرچہ یہ کام افتاء کے دائرے میں آتا ہے، مگر افتاء کے لیے فقہ اور اُصولِ فقہ سے مکمل واقفیت ضروری ہے، اس ضمن میں اُصولِ فقہ کے طلبہ کو یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ مسائل کے احکام کا بیان اور ان کی درجہ بندی کا تعین اس اُصولی عالم کا کام ہے جو اُصول میں

کمال ومہارت کے بعد افتاء کے منصب سے عملاً وابستہ ہو، یہ ہر عالم کا کام نہیں ہے۔

ادلۃ الاحکام

ادلۃ الاحکام، ادلۂ شرعیہ یا ادلۂ تفصیلیہ سے مراد وہ مآخذ ہیں جہاں سے فقہاء مجتہدین نے فقہی واجتہادی مسائل اخذ فرمائے ہیں یا وہ طرق ہیں جن طرق سے فقہی فروعات حاصل کی گئی ہیں، ایسے مآخذ، بنیادیں اور طرق دو قسم کے ہیں:

۱:-اصلی/ اتفاقی مآخذ　　۲:-ذیلی/ اختلافی مآخذ

مآخذِ اصلیہ اتفاقیہ چار ہیں:

۱:-کتاب اللہ　　۲:-سنت رسول اللہ (ﷺ)　　۳:-اجماع　　۴:-قیاس

مآخذِ فرعیہ اختلافیہ آٹھ ہیں:

۱:-قولِ صحابی　　۲:-شرائع من قبلنا　　۳:-استحسان　　۴:-مصالحِ مرسلہ

۵:-سدِ ذرائع　　۶:-استصحابِ حال　　۷:-عرف وعادت　　۸:-تعاملِ اخیار

ان میں سے بعض حنفیہ کے ہاں حجت ہیں، دیگر ائمہ اس کا انکار فرماتے ہیں، بعض دیگر کے ہاں معتبر ہیں اور حنفیہ کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے۔ ان مآخذ کے تعارف پر مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، شیخ ابوزہرہ مصری رحمۃ اللہ علیہ نے ائمہ مجتہدین کے تعارفی سلسلوں میں ''**الأصول التی بنی علیھاالإمام ...... فقھہٗ**'' کے مستقل عنوان کے تحت اس موضوع کی تنقیح وتہذیب فرمائی ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اجمالی طور پر اپنے طالب علم کو یہ بتائیں کہ فقہی مآخذ کی فہرست کیا ہے، اور ہماری درسی کتاب میں اس ماخذ کے مکمل تعارف سے کہاں کہاں تعرض کیا گیا ہے، اور کہاں کہاں رہ گیا ہے، مثلاً: اصول الشاشی میں زیادہ تر حصہ اُصولِ فقہ کی صرف ایک بحث ''**دلالۃ الکلام**'' کے گرد گھومتا ہے، مآخذ میں سے صرف ادلہ اربعہ اتفاقیہ سے بحث ہے، یہ کتاب اُصولِ فقہ کے سارے مباحث کو جامع نہیں ہے، جو طالب علم صرف روایتی درسیات پڑھ کر اُصولِ فقہ کو اول آخر اُصول سمجھ کر فارغ ہوگا، یقیناً وہ اُصولِ فقہ سے متعلق ناقص خیال کا حامل ہی کہلائے گا، اس لیے مآخذ کا قدرے تعارف' مبادیات کے درس کے طور پر ہونا چاہیے، یا ان ذیلی مآخذ سے متعلق درسی کتاب میں جہاں اشارہ یا اجمالی تذکرہ ملتا ہے، وہاں پر قدرے تفصیلی گفتگو کرنی چاہیے۔

مقاصدِ شریعت ومدارجِ احکام

احکامِ شرعیہ کے مقاصد، حِکم، اسرار وعلل عقلیہ کیا ہیں؟ یہ بھی اُصولِ فقہ کے مباحث میں

شامل ہے، مگر ہماری درسی کتب میں اس طرف رہنمائی بڑی دیر سے مخصوص لوگوں کو تخصصات میں نصیب ہوتو ہو، اس سے قبل نظر نہیں آتی، تخصصات میں جہاں ''**الموافقات للشاطبیؒ**''، ''**حجة اللّٰه البالغة**'' اور ''**الأشباه والنظائر**'' پڑھائی جاتی ہیں، وہاں یہ بحث سامنے آتی ہے، ورنہ عام طلبہ کی نظروں سے یہ بحث اوجھل رہتی ہے، پس اختصار کے ساتھ اتنا بتایا جائے کہ احکامِ شرعیہ کے عمومی مقاصد پانچ ہیں:

۱:- حفظِ دین ۲:- حفظِ نفس ۳:- حفظِ نسل ۴:- حفظِ مال ۵:- حفظِ عقل

(الموافقات فی اصول الشریعۃ لابراہیم بن موسی الغرناطی الشاطبی [متوفی: ۷۹۰ھ]، کتاب المقاصد، النوع الاول فی بیان قصد الشارع فی وضع الشریعۃ، ج:۱، ص:۸، دار الکتب العلمیۃ)

ان مقاصد کو فقہی کتابوں میں چار بڑے عناوین کے تحت منقسم احکام کے ضمن میں پھیلایا گیا ہے، یعنی عبادات، مناکحات ومعاشرت، معاملات اور خصومات وغیرہ، ان مقاصدِ خمسہ کو بنیادی انسانی حقوق بھی کہا جاتا ہے، اور فلسفۂ حیات سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، ان اُمور کی توضیح وتنویع سے بنیادی فائدہ یہ ہوگا کہ حیاتِ انسانی کا حقیقی فلسفہ اور حقوقِ انسانی کی محیط نگرانی کا ضابطہ صرف اور صرف اسلام میں ہے اور جو لوگ دنیا میں انسانی حقوق کے دعویدار اور علمبردار بنے ہوئے ہیں وہ انسانی حقوق کے نام پر حق تلفیوں کے مرتکب ہورہے ہیں۔ غرض یہ کہ جو امر اِن مقاصدِ خمسہ میں سے ایک یا چند کے تحفظ میں معاون ومحرک بنتا ہوا ُسے حکمت ومصلحت کہا جائے گا، اور ایسی حکمت ومصلحت کا اثر شرعی حکم کے لیے قابلِ اعتبار مانا جائے گا۔

جب کسی چیز پر کسی کا استحقاق مانا جائے تو اس کا درجہ کیا ہے؟ جس چیز کو ہم حاصل کرنا چاہ رہے ہیں، اس چیز کے حصول یا ادائیگی میں کوئی حد بندی اور درجہ بندی بھی ہے یا نہیں؟ شریعتِ اسلامیہ کسی حق کو تسلیم کرتے ہوئے اور صاحبِ حق کے لیے حق ثابت کرتے ہوئے احکامِ شرعیہ کے حوالے سے درجہ بندی کی قائل ہے، جس طرح احکام میں فرض، واجب اور حرام ومکروہ وغیرہ کی درجہ بندی ہے، اسی طرح احکام کے اثبات اور حقوق کے تسلیم کرنے کے لیے بھی درجہ بندی ہے، اس کو مدارجِ احکام سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب کوئی انسان کسی چیز کو اپنا حق قرار دے کر اس کے حصول کے درپے ہوتو سب سے پہلے اس حق کی جائز اور ناجائز کے اعتبار سے تشخیص ضروری ہوتی ہے، پھر اگر جائز قرار پائے تو پھر اس میں تفصیل ہے کہ ہر جائز ومباح پر انسان کا حق تسلیم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اگر تسلیم کیا جائے تو کس حیثیت

میں؟ فقہائے کرام نے ان باریکیوں اور گہرائیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بندوں کے استحقاق سے متعلق احکام کی درجہ بندی کی وضاحت فرمائی ہے، یعنی جس چیز کو آپ حق سمجھ کر حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ آپ کے لیے ضرورت کے درجہ میں ہے، حاجت کے مرتبے میں ہے، تحسین کے رتبے میں ہے، تعیُّش کے احاطے میں ہے یا فضول کے دائرے میں ہے؟ انسان کے ہاں قابلِ استحقاق چیزوں کی اسی تقسیم کو اُصولیین ضرورت، حاجت، منفعت، زینت اور فضول سے بھی تعبیر کیا کرتے ہیں۔

شرعی احکام کے لیے وضع کردہ یہ مدارج فی زمانہ اصولی فقیہ کے پیشِ نظر ہونا انتہائی ضروری ہیں، اس لیے کہ مغربی معاشیین نے ضروریات وتعیُّشات کو خلط ملط کر کے مغربی معاشی نظام کو زبردست ہوّا بنادیا ہے اور ہر خواہش کی تکمیل کو ضرورت باور کرایا جاتا ہے، پھر ہمارے بعض اسلامی معاشیین جب فقہ المعاملات کے راستہ سے مغربی معاشی نظام کا جائزہ لینے جاتے ہیں تو جس تعیُّش اور آسائش کو مغرب نے ''ضرورت'' کہہ کر جواز اور رواج بخشا ہوتا ہے، یہ اسلام کا رلوگ بھی اُسے ''ضرورت'' کہہ کر سندِ اسلام دینے بیٹھ جاتے ہیں اور مغرب کی پھیلائی ہوئی معاشی صورتوں پر اسلامی لیبل لگا کر اسلامی معیشت کے قیام ونفاذ کے شادیانے بجانے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مغرب کے ''نظریۂ ضرورت'' اور اسلامی ''قاعدۂ ضرورت'' کے درمیان لفظی قربت کے باوجود زمین وآسمان کا فرق ہے۔

ہمیں چاہیے کہ انسان کے بنیادی حقوق، احکامِ شرعیہ کے مقاصدِ خمسہ اور مدارجِ احکام کے مراتبِ خمسہ کے بارے میں دورانِ درس کچھ نہ کچھ معلومات اپنے اُصولی طالب علم کو دینے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر بظاہر اُصولِ فقہ کی ابحاث ادھوری رہ جاتی ہیں۔

دلالةُ الکلام

اُصولِ فقہ کے مباحث میں پانچویں بحث ''**دلالة الکلام**'' ہے۔ ''**دلالة الکلام**'' کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے فقہی مآخذ بالخصوص قرآن وسنت کی زبان عربی ہے۔ عربی تعبیرات، گفتگو کے اسالیب اور کلمات کے مقاصد اور محاورات سے واقفیت لازمی ہے، اس کے بغیر فقہی احکام کے مدلول ومصداق کا تعیُّن مشکل ہوتا ہے، مثلاً: ''کُلُوْا وَ اشْرَبُوْا'' بھی امر ہے اور ''أَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوْا الزَّکٰوۃَ'' بھی امر ہے، ''فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ'' میں ایمان اور کفر دونوں کے لیے صیغۂ امر لایا گیا ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ صیغۂ امر کب اور کہاں کس معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے؟ اگر امر کو صرف وجوب کی دلالت کے لیے مانا جائے تو اس سے بہتیرے شرعی احکام میں خلل آئے گا۔

اسی طرح حرف کی بحث میں ''واؤ''، ''فاء'' اور ''باء'' وغیرہ جب کسی حکم کے ساتھ ہوں تو

وہاں ان حروف کے استعمالات کا مکمل ادراک لازمی ہے، جو ''واو'' کے استعمالات سے واقف ہوگا وہی یہ سمجھ سکے گا کہ ''واو'' جمع کے لیے ہے یا ترتیب کے لیے ہے، وغیرہ وغیرہ، اسی طرح ''فاء'' تفریع کے لیے ہے، عطف کے لیے ہے یا جزا کے لیے ہے۔ اُصولِ بزدوی واُصولِ سرخسی میں اُصولِ فقہ کی اس بحث کو اہمیت کے ساتھ ابتدائی ابحاث میں جگہ دی گئی ہے۔ (اُصول البزدوی، باب الامر، ص:۱۹، ط: نور محمد)

اس لیے اُصولِ فقہ کے اساتذہ درس کے دوران عربی زبان کے دلالتی پہلو کو بطورِ خاص اہمیت دیں، ہماری کوشش یہ رہنی چاہیے کہ ہم اُصولِ فقہ سمجھنے اور سمجھانے کے ساتھ خود اُصولِ فقہ کو بھی تمام مباحث کے ساتھ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں۔

توضیح وتطبیق

تمہیدی گفتگو کے بعد اب اُصولِ فقہ کی تدریس کے توضیحی پہلو کی طرف آتے ہیں، یعنی اُصولِ فقہ کی جو کتاب شاملِ درس ہے، اس کتاب کے مندرجات کی تفہیم کے لیے مدرس کو کیا کرنا چاہیے؟ اور یہی ہمارا بنیادی مقصد ہے، اور اس کو درج ذیل امور کا التزام کرنا پڑے گا:

۱:...... سبق کی تیاری..... یہ عمل ہر کتاب کے لیے کرنا ہوتا ہے، جیسے فقہ کی تیاری، مطالعہ اور ضبط کی ترتیب عرض کی گئی ہے، یہ عمومی ہدایت ہے۔ تیاری کے سلسلہ میں استاذ اور طالب علم دونوں کو تیاری کرکے آنے کی ضرورت ہے، جس کا اوپر بیان گزر چکا ہے۔

۲:...... طالب علم کو عبارت فہمی کی عادت ڈالنے کی محنت کرنا، عبارت فہمی کے لیے صحیح عبارت خوانی ضروری ہے اور صحیح عبارت خوانی کے لیے تلفُّظ، ادائیگی، اعراب کی درستگی اور جملوں کی ابتدا وانتہا کا علم ہونا ضروری ہے، اس مقصد کے لیے موقع بموقع صرف ونحو سے استمداد اور تذکار ضروری ہوتا ہے۔

۳:...... عبارت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم طالب علم سے کہلوایا جائے، شروع شروع میں یہ مشق زیادہ کی جائے، تاکہ طالب علم عادی ہونا شروع ہوجائیں۔

۴:...... طالب علم کی دلچسپی حاصل کرنے اور استعداد کو بیدار کرنے کے لیے قدیم طرز پر طالب علم سے آمدہ سبق کی تیاری کرکے استاذ کے گھنٹے میں طلبہ کے سامنے سبق پیش کرنے کی محنت بھی کرائی جائے، پھر طالب علم کے فہم میں جو کمی رہ گئی ہو اُستاذ اس کی نشاندہی کرکے کمی دور کرنے کی کوشش کرے، اور آخر میں سبق کا خلاصہ ''آمادگی'' کے انداز میں استاذ طلبہ کے سامنے پیش کرے۔

۵:...... درس کی مقدار میں توازن کا لحاظ بہت ضروری ہے، مبادیات کے طور پر ذکر کردہ مباحث یا تحلیلِ عبارت سے متعلق مشقی فوائد کا یہ مطلب قطعاً نہیں لینا چاہیے کہ شروع شروع میں ہم کتاب سے خارج مباحث پر پوری توانائی صرف کریں اور کتاب کے مندرجات کی نوبت آنے پر محض

نصاب پورا کرنے کی فکر میں سبک رفتاری کا شکار ہو جائیں، اس کمزوری سے بچنے کے لیے کم از کم تین اُمور کا التزام مفید ہوگا:

الف: مدرس نے سبق کی تیاری کے دوران تفہیم کے لیے اور تسہیل کے لیے جو درس کا خاکہ بنایا ہے، درسی تقریر کو اسی تک محدود رکھنے کی کوشش کرے۔

ب: مقررہ نصاب کے صفحات یا مباحث کا اندازہ لگا کر یومیہ درس کی مقدارِ خواندگی طے کر لی جائے، مثلاً: آدھا صفحہ، پورا صفحہ یا دو صفحے وغیرہ طے کر لیے جائیں، اگر آج ہدف پورا نہیں ہو رہا تو اگلے دن یا دنوں میں اس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔

ج: یہ سب کچھ مکمل حاضری کی صورت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے، یعنی گھنٹے اور مہینے کی حاضری دونوں مکمل رکھی جائیں۔

۶:...... حنفی اُصولِ فقہ دیگر فقہی اُصولوں کے مقابلے میں ممتاز اور سہل ہیں، بایں معنی کہ ہمارے اُصول محض نظری نہیں ہیں، بلکہ تطبیقی ہیں، اصل کے ساتھ فرع بھی توضیح وتطبیق کے طور پر موجود ہوتی ہے، اس تطبیق وتوضیح سے مناسبت وممارست پیدا ہونا درحقیقت کتاب فہمی ہے، اور کتاب پڑھنے کا ایک مقصد ہے، اور ہمارے ہاں اسی تطبیق کی مہارت کو اُصولِ فقہ کی مہارت کہا جاتا ہے، اس تطبیق وتوضیح کے لیے درج ذیل اُمور کا التزام معاون ہوسکتا ہے:

الف:- اصل کو عام فہم انداز میں پہلے بتایا جائے، اس کے بعد بطور مثال کے کتاب میں ذکر کردہ تفریع یا تفریعات ذکر کر دی جائیں، مثلاً: کہا جاتا ہے کہ نصِ قرآنی کے مدلولِ خاص پر خبر واحد سے زیادتی کرنا حنفیہ کے ہاں جائز نہیں، جس کی دوسری مناسب تعبیر یہ ہے کہ خبر واحد کے ذریعہ نصِ قرآنی سے ثابت شدہ حکم جیسا حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس کی یہ تعبیر بھی کی جاسکتی ہے کہ اثباتِ حکم کے لیے خبرِ واحد کتاب اللہ کے ہم پلہ نہیں ہوسکتی، مثلاً: آیتِ وضو سے وضو کے ارکانِ اربعہ کی فرضیت ثابت ہے، اخبارِ آحاد سے تسمیہ، نیت، موالات، ترتیب اور تیامن ثابت ہوتا ہے، اگر اسے فرض کی مانند کہیں تو خبر واحد اور کتاب اللہ کے درجہ میں فرق ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ دونوں ثبوت کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں، جب اصل یہ ہے کہ خبر واحد اور کتاب اللہ کے مرتبوں میں تفاوت ہے تو ان سے ثابت ہونے والے احکام میں بھی تفاوت ہونا لازمی ہے، لہٰذا اعضاء وضو سے متعلق کتاب اللہ کا حکم فرض ہوگا، اخبارِ آحاد کا مفاد سنت ہوگا، اگر وضوعبادتِ غیرمقصودہ نہ ہوتی تو واجب بھی کہہ سکتے تھے۔

ب:- اس تطبیقی عمل میں مزید افادیت کے لیے کتاب کی مثالوں سے ہٹ کر بھی مثالیں

بتائی جائیں، تاکہ تطبیق کا یہ عمل کتاب کی تفہیم تک محدود نہ رہے۔ اس کے لیے اُصولِ فقہ کی زیرِ درس کتاب کے علاوہ بقیہ کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے، بالخصوص ماضی قریب کے مؤلفین کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے، شیخ ابوزہرہ مصری، شیخ وہبہ زحیلی اور شیخ علی الخفیف رحمہم اللہ کی کتابیں قابلِ استفادہ ہیں، ان کتابوں سے تعبیر کی سہولت کا فائدہ بھی حاصل ہوگا، جب کہ ہماری قدیم کتب میں سے ''**الأشباه والنظائر**'' لابن نجیم اور ''**تقويم الأدلة**'' لأبی زید الدبوسی خوب معاون ہوسکتی ہیں۔

ج:- کتاب کی بعض مثالیں اصل پر بمشکل منطبق ہوتی ہیں، ایسے موقع پر خارجی مثالوں کے ذریعہ اصل سمجھادیں، اصل اور مثال کے درمیان عدمِ انطباق کی باادب نشاندہی کردی جائے، مثلاً: اصول الشاشی کے درس میں حقیقت ومجاز کی بحث پڑھتے ہوئے حقیقتِ متعذرہ کی مثال آتی ہے: ''**إذا حلف لايأكل من هٰذه الشجرة ... لوحلف من عين الشجرة لايحنث**'' یہاں محلوف علیہ عدمِ اکل ہے، جسے حقیقتِ متعذرہ کی مثال بنایا گیا ہے، حالانکہ عدمِ اکل متعذر نہیں ہے، اکل متعذر ہے۔ اس اصل اور مثال کے درمیان تطبیق میں روایتی تکلف کی بجائے اگر آسان انداز میں یوں کہا جائے: ''**واللّٰـه لأكُلَنَّ هٰذاالجبلَ الضخمَ مبتلعًا وإلا عليَّ كذا وكذا**'' تو شاید بات بآسانی سمجھ آجائے، تطبیق وتعبیر کی سہولت کے لیے علامہ شوکانی رحمہ اللہ کی ''**إرشاد الفحول**'' بھی مفید ہے۔

جب کہ ہمارے استاذِ گرامی حضرت مولانا محمد انور البدخشانی دامت برکاتہم کی تسہیلات وتیسیرات بھی انتہائی مفید ہیں، متعلقہ درسی کتابوں کے مغلق مقامات یا تعبیری دقتوں سے یسر وسہولت کے ساتھ نکلنے کے لیے استاذِ محترم کی کتابوں نے ہمارے جیسے طلبہ اور اچھے اچھے مدرسین کو خوب فائدہ پہنچایا ہے، تیسیر اُصولِ فقہ، تسہیل اصول الشاشی اور تسہیل الحسامی (**التيسير المهذب**) وغیرہ لائقِ استفادہ ہیں۔

۷:......فن کی جو اہم اہم اصطلاحات دورانِ درس سامنے آئیں، انہیں سمجھا کر یاد رکھنے کی تاکید کی جائے، مثلاً: عام، خاص، مطلق، مقید، حقیقت، مجاز۔ پھر جو اصطلاحات متقارب المفہوم ہوں ان کے درمیان وجوہِ فرق کی پہچان بھی کرائی جائے، مثلاً: خاص ومعرفہ اور عام ونکرہ کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کا لحاظ رکھا جائے، یہ اصطلاحات امتحان میں بھی پوچھی جائیں۔

۸:......تمہیدی گزارشات میں پڑھا کہ اُصولِ فقہ کم از کم پانچ مباحث پر مشتمل فن کا نام ہے، ہماری درسی کتابوں میں ان مباحث سے کتنا تعرض ملتا ہے اور کس حد تک بے التفاتی پائی جاتی ہے، سب سے پہلے مدرس کو اس اہم نکتے سے واقفیت ہونی چاہیے، اس کے بعد طلبہ کے سامنے بھی اس مضمون کو

حسبِ موقع دہرایا جائے، تاکہ ذی استعداد طلبہ کتاب فہمی کے بعد اُصولِ فقہ کے مباحث کی دیگر جہات سے شناسائی کے لیے متوجہ ہوسکیں، مثلاً:

● ''أُصول الشاشی'' میں زیادہ تر حصہ ''دلالۃ الکلام'' سے متعلق مباحث پر مشتمل ہے۔ ادلۂ شرعیہ میں سے مآخذِ اصلیہ اتفاقیہ کا بیان تو ہے، لیکن مآخذِ ذیلیہ اختلافیہ سے مکمل بحث نہیں ہے۔ اسی طرح مقاصدِ احکام و مدارجِ احکام کا پہلو یہاں نہیں ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُصول الشاشی کے طالب علم کو ان بھاری مباحث میں اُلجھانا تدریس کے تدریجی ضابطہ کے خلاف ہے تو یہ بات اپنی جگہ معقول ہے، لیکن خود کتاب کی ابتدائی ابحاث بھی تو ابتدائی طالب علم کے لیے کافی دشوار ہیں، جب ان ابحاث سے مناسبت ہو جاتی ہے تو ان ابحاث کے اشارات بھی زیادہ نامانوس نہیں رہیں گے۔

● دوسری کتاب ''نور الأنوار شرح المنار'' للشیخ احمد (ملا جیون) الصدیقیؒ [۱۰۴۸ھ-۱۱۳۰ھ] ہے، اس میں حاکم اور احکامِ شریعت کے مقاصد و مدارج سے تعرض نہیں فرمایا گیا، تقریباً کتاب کا آدھا حصہ اُصولی مباحث میں سے صرف دلالتِ کلام اور اس کی تعریفات اور ردوقدح سے تعلق رکھتا ہے۔ فقہ کے ذیلی اصول و ذیلی مآخذ کا یہاں بھی کوئی اتا پتا نہیں ملتا، البتہ قیاس کے ساتھ استحسان کی بحث قدرے تفصیلی انداز میں مل جاتی ہے۔

● تیسری درسی کتاب ''منتخب حسامی'' ہے، اس کا دائرۂ بحث بھی تقریباً ''نور الأنوار'' والا ہے، ایجاز و اغلاق بھی حل طلب ہے، جس کے حل کے لیے ہمارے جیسے مدرسین کے لیے استاذ بدخشانی مدظلہم کی تسہیل ازبس ضروری ہے، ورنہ استاذ اور طالب علم کا زیادہ تر وقت اُصولِ فقہ اخذ کرنے سے زیادہ حلِ کتاب میں صرف ہوتا رہے گا۔ بہرحال اس کتاب میں یہ خوبیاں بھی ہیں:

الف: مباحث کی ترتیب، بزدوی وسرخسی کی ہے۔

ب: قیاس واستحسان پر یہاں بھی اچھی بحث فرمائی گئی ہے۔

ج: اہلیت وعوارضِ اہلیت کی ابحاث مناسب انداز میں بیان فرمائی گئی ہیں۔

د: ''أُصول الفقه المقارن'' کی ایک جھلک بھی اس کتاب میں ملتی ہے کہ دیگر ائمہ کے ہاں دلالتِ کلام سے متعلق وہ معتبر اصول جن کا حنفیہ کے ہاں اعتبار نہیں ہوتا، ان کو وجوہِ فاسدہ کے عنوان سے بالتفصیل ذکر فرمایا گیا ہے، گو کہ یہ مناظرانہ ابحاث سہی، مگر اُصولِ فقہ کو ان ابحاث سے خالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

یہ ساری منفرد ابحاث چونکہ حسامی کے آخری حصہ میں ہیں، اس لیے جہاں ممکن ہو حسامی کو

شروع کی بجائے سنت کی بحث سے اختتامِ کتاب تک شاملِ درس رکھا جائے، ابتدائی حصہ میں توانائی صرف کرنے کی بجائے شاید یہ زیادہ مفید ہو۔

● اگلی درسی کتاب ''**شرح التلویح علی التوضیح لمتن التنقیح**'' لسعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی [متوفی: ۷۹۳ھ] '' ہے، جو اپنے توضیحی نقاش اور کلامی ردوقدح کے حوالے سے مشہور ہے، اس کتاب کو تشحیذِ اذہان، ذہنی استعداد اور تحقیقی و تنقیحی ملکہ پیدا کرنے کے لیے مفید سمجھا جاتا ہے۔ مگر فی زمانہ استعداد کے انحطاط وضعف کی وجہ سے کتاب ہذا کی جدلی ابحاث کے بیچ سے اُصول فقہ دریافت کرنے اور محفوظ رکھنے میں کمزور استعداد طلبہ کو کافی دشواری پیش آتی ہے، گوکہ اس درجے کے طلبہ کسی حد تک علمی و ذہنی پختگی حاصل کر ہی چکے ہوتے ہیں، اس لیے اس درجہ کے لحاظ سے اُصولِ فقہ کی تدریس کے مقاصد کے حصول کے لیے یہ کیا جاسکتا ہے کہ: اُصولِ فقہ کے حوالے سے ہماری درسی کتب میں صرف حنفی اُصول پڑھائے جاتے ہیں، جب کہ فقہ میں دیگر مذاہب کی آراء بھی موازنہ، مقارنہ اور محاجہ کے طور پر ذکر کی جاتی ہیں۔ اُصولِ فقہ میں بھی اگر یہ اسلوب اپنایا جائے اور اس اسلوب کی کتاب ''توضیح وتلویح'' کے ساتھ شامل کی جائے تو مناسب ہوگا، مگر درسی کتاب کا انتخاب چونکہ کئی پہلوؤں کی رعایت کا متقاضی ہوتا ہے، اس لیے زیادہ جد کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ توضیح تلویح کا مدرس علامہ شوکانیؒ کی ''إرشادالفحول'' (**إرشاد الفحول إلی تحقیق الحق من علم الأصول**، محمد بن علی بن محمد بن عبد اللہ الشوکانی الیمنی) اور شیخ ابوزہرہؒ کی ''**علم أصول الفقه**'' سے استفادہ کرتے ہوئے مختلف مناسبات میں محاضرے کی صورت میں طلبہ کو مستفید فرمائے۔ بالخصوص اجتہاد اور اس کے متعلقات، اجتہاد، اجتہادِ جدید اور تجدُّد کے بارے میں بتائے، مجتہد کی اہلیت اور اوصاف، اجتہاد کی شروط وقیود وغیرہ کی طرف رہنمائی کی جائے، نیز اجتہاد کے مراحل، تحقیقِ مناط، تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط جیسی گم شدہ اصطلاحات سے طلبہ کو روشناس کرائے۔ (روضۃ الناظر وجنۃ المناظر فی اصول الفقہ علیٰ مذہب الامام احمد بن حنبل، لابن قدامۃ [متوفی: ۶۲۰ھ])

نیز فقہ اسلامی کے ان ذیلی مآخذ سے ضرور متعارف کرایا جائے، جو عموماً نو پیش آمدہ مسائل کے لیے بنیاد سمجھے جاتے ہیں، جیسے: عرف وعادت، سدِ ذرائع، اور مصالحِ مرسلہ وغیرہ کی حقیقت اور ان کا بجا یا بے جا استعمال بتایا جائے۔

اُمید ہے کہ اس ترتیب سے ہمیں اُصولِ فقہ کی تدریس کے مقاصد وفوائد حاصل ہوجائیں گے۔

۹:...... اصل اور فرع کے درمیان تطبیق اور ارتباط کو سمجھنے کے لیے استدلال وادلال کا طریقہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، استدلال کے طریق سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ماخذ کے طور پر کتاب میں جو

نص ذکر کی گئی ہے وہ نص بورڈ پر لکھی جائے یا زبانی بتائی جائے ، پھر اس نص سے جو مسئلہ مستنبط کیا گیا ہے اس مسئلے کے استنباط واستنتاج کا طریقہ بتایا جائے ، مثلاً :

''وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ'' میں مسح کا حکم ہے، اب کل سر کا مسح ہے، یا بعض کا؟ اس میں اختلاف ہے، اس اختلاف کی ایک بنیاد لفظ ''ب'' ہے جو ''رُءُوْسِكُمْ'' پر داخل ہے، اگر باء کو زائدہ کہیں تو مسح کا حکم پورے سر کو شامل ہوگا، جیسے: مالکیہ کے ہاں اور ''ب'' کو تبعیض کے لیے لیا جائے تو مسح کا وجوبی حکم سر کے بعض حصے کے ساتھ متعلق ہوگا، جیسے جمہور کے ہاں ہے، پھر اس بعض کی اپنی تفصیل ہے، ہم اُصول تک پہنچنے کے لیے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس دلیل سے فلاں امام نے یہ استدلال کیا ہے، جن کے نتیجے میں ان کے ہاں مسح کا یہ حکم ہے، فلاں امام نے یہ استدلال کیا جس کا یہ نتیجہ نکلا۔

اسی صورت کو اُلٹا کر دیں کہ پہلے مسئلہ ذکر کریں، مسئلہ میں جو اقوال ہیں وہ بتائے جائیں، پھر اس فرع اور قول کی بنیاد کے طور پر دلیل اور ماخذ کو ذکر کر دیں، یہ ترتیب ایک طرح فقہ کے درس کی وجہ سے ہمارے طلبہ کے لیے زیادہ مانوس ہے، وہ اس طریق سے فقہی اُصول کو جلدی سمجھ پائیں گے۔

تفریع وتذییل

اُصولِ فقہ کی تدریس کے دوران تمہید وتوضیح سے جب فارغ ہو جائیں تو تین اضافی اُمور کی کوشش بھی کی جائے :

۱:- جیسا کہ اوپر بھی بتایا گیا کہ اُصول کی تفہیم کے لیے کتاب کی مثالوں پر اکتفا کی بجائے درسی کتاب کے علاوہ اُصولِ فقہ کی دیگر کتابوں سے مثالیں بھی نکال کر بتائی جائیں، جس کو فروع میں اُصول فقہ کے اجراء کا عنوان بھی دیا جا سکتا ہے۔

۲:- آیات الاحکام منتخب کی جائیں اور ان آیات سے ثابت کیے گئے احکام کے طریقۂ اثبات معلوم کرنے کے لیے فقہی تفاسیر، قرطبی (''الجامع لأحكام القرآن'' ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبیؒ [متوفی :۶۷۱ھ])، جصاص (''أحكام القرآن'' احمد بن علی ابوبکر الرازی الحنفی [متوفی :۳۷۰ھ]) اور مظہری (''التفسير المظهري'' قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ [متوفی :۱۲۲۵ھ]) وغیرہ سے کچھ کچھ مطالعہ کروایا جائے۔ اس محنت کو استدلالی اجراء کا نام دیا جا سکتا ہے۔

۳:- ہر بحث کے اختتام پر مشقی سوالات بنائے جائیں اور ان سوالات کے جوابات سابقہ خواندگی کی روشنی میں طلبہ سے نکلوائے جائیں، اس محنت کے لیے استاذِ محترم مولانا محمد انور بدخشانی زید مجدہم کی ''تسہیل اصول الشاشی'' سے مدد لی جا سکتی ہے۔

ائمہ اربعہ کے اختلاف کے بنیادی اجتہادی اصول

ہمارے سماج میں اختلافات اتنے زیادہ ہیں کہ جہاں اختلاف کا لفظ سماعتوں سے ٹکرایا وہیں نفرتوں کا تعفُّن محسوس کرنے کے لیے ناک پھیلنا یا سکڑنا شروع ہو جاتی ہے، اس لیے ائمہ مجتہدین بالخصوص ائمہ اربعہ کے اختلافِ رائے کی بنیاد بننے والے اصول یا اسباب کی طرف جانے سے قبل نفسِ اختلاف اور علمی و اجتہادی اختلاف کے بارے میں چندگزارشات پیشِ نظر رہنا مفید معلوم ہوتا ہے:

۱:-کسی بھی مسئلہ میں علمی و اجتہادی اختلاف مذموم نہیں، بلکہ محمود و مطلوب ہوتا ہے، کیوں کہ اگر اختلاف کا سبب نص کا احتمالی پہلو ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صاحبِ وحی نے خود اختلاف کی گنجائش دی ہے، مثلاً: ''قُرُوْء'' کے مصداق کی تعیین میں طہر اور حیض کے اختلاف کو مذموم قرار دینے کے بجائے منشأ خداوندی کے قریب یا عین مطابق کہنے کی گنجائش بھی معلوم ہوتی ہے۔

۲:-جب ائمہ کا اختلاف نص کے احتمالی پہلو یا دلائل کے تنوُّع کی بنیاد پر ہو تو ایسے اختلاف کو اختلاف کے بجائے اقوال یا توجیہ سے تعبیر کرنا چاہیے، وہ حقیقت میں اختلاف ہے ہی نہیں، جیسے: فقہاء حنفیہ کی باہمی اختلافی آراء کو اقوال سے تعبیر کیا جاتا ہے اور شافعیہ کے ہاں ایسی آراء کو ''وجوہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسے اختلاف کے بجائے راہِ وسعت کے اختیار سے تعبیر کرنا چاہیے۔ حضرت طلحہ بن مصرف رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے سامنے فقہاء کے اختلاف کا تذکرہ ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ: ''**لا تقولوا: الاختلاف ، و لکن قولو: السعة.** '' (حلیۃ العلماء، ج:۵، ص:۱۱۹ بحوالہ راہِ عمل، خالد سیف اللہ) یعنی فقہاء کے اختلاف کو اختلاف سے تعبیر کرنے کے بجائے گنجائش سے تعبیر کرو۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ایسا ہی منقول ہے کہ انہوں نے فقہاء کے اختلافات کی بابت لکھی گئی کتاب کے بارے میں فرمایا کہ: ''**لا تسمّہٖ کتابَ الاختلاف و لکن سمّہٖ کتابَ السعة** '' (مجموع الفتاویٰ لابن تیمیہؒ [متوفی: ۷۲۸ھ]، تفسیر سورۂ بقرہ، ج:۱۴، ص:۱۵۹ مجمع الملک فہد) ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ جامعہ کے امتحانات کے سوالیہ پرچوں کی ترتیب کے دوران مختلف الآراء مسائل میں فقہاء و ائمہ کے اختلاف جیسے روایتی لفظ کو بڑے التزام کے ساتھ ''اقوال'' سے تبدیل کروایا کرتے تھے۔ الغرض ائمہ کے اختلافِ رائے کو اختلافات کی بجائے آراء اور اقوال سے تعبیر کرنا ہی قرینِ صواب ہے۔ ائمہ کی آراء کو اختلاف سے تعبیر کرنا ایک گونہ لفظی تسامح کے درجے میں ہے۔

۳:-ائمہ کی آراء کو آپ اقوال کہیں یا اختلاف، بہر حال یہ ایک حقیقت ہے، اس حقیقت سے گزرتے ہوئے ہمیں علمی و اجتہادی اختلافات کے اصول و آداب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ نیز

جس طرح اختلاف کرنے کے آداب ہیں، اسی طرح ان اختلافات میں استفادے کے اصول وآداب بھی قابلِ لحاظ ہیں۔

یہاں پر بعض لوگ افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ایک مُفرِّط طبقہ یہ کہتا ہے کہ فقہاء نے دین کو مختلف شناختوں میں تقسیم کردیا ہے، لہٰذا حنفی شافعی بننے کی بجائے اسلامی اور محمدی بنو۔حنفی، شافعی کے چکروں میں نہ پڑو۔ یہ تفریط فقہ واجتہاد اور استنباط واستنتاج کے عمل سے لاعلمی وجہالت پر مبنی ہے، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ حنفی، شافعی وغیرہ ''دین'' کا نام نہیں ہیں، بلکہ ''منزلِ محمدی'' تک پہنچنے کے لیے مختلف مذاہب (طرق وسبل) کا نام ہیں۔

اس کے برعکس مُفرِط طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذاہبِ اربعہ برحق ہیں، آپ ان مذاہب سے حسبِ منشأ جو لینا چاہیں یہ جائز ہے، حالانکہ خود اربابِ مذاہب اور مذاہب کے شارحین نے اس طرزِ عمل کی سخت تشنیع فرمائی ہے۔اسے مذموم انتقاء، تتبعِ رُخص اور تلفیق بین المذاہب قرار دیتے ہوئے اتباعِ ہویٰ ٹھہرایا ہے۔

ہاں! اگر ضرورتِ شدیدہ کے تحقُّق کے نتیجہ میں معمول بہ مذہب سے دوسرے مذہب کی طرف عدول یا استفادے کی نوبت آئے تو اس کے اصول، قواعد اور شرائط وآداب کی مکمل پاسداری کے ساتھ گنجائش ہے۔اس گنجائش سے استفادے کے وقت اختلافِ ائمہ کو وسعتِ شرعی کہہ کر اختیار کرنے والے کو ملامت نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ہے وہ اجتہادی اختلاف جسے وسعت اور گنجائش کہا جاتا ہے۔اگر کوئی مقلد اس گنجائش کی آڑ لیتے ہوئے مخصوص مقاصد کے لیے شروع سے ہی راحت کوشی اور سہولت طلبی کے لیے مذاہبِ متبوعہ کو چراگاہ سمجھ کر مختلف چراگاہوں میں چرندہ بننے چلا جائے تو شرعاً وفقہاً قابلِ ملامت ہے، بلکہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول کسی مخصوص ضرورت کے تحت ایسا کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ یہ بات آپ نے تین طلاق کو تین ماننے والے کے حق میں فرمائی ہے جب وہ تین طلاقیں دینے کے بعد ایک شمار کروانے کے لیے تین کو ایک قرار دینے والی رائے کے پیچھے اپنا جرم چھپانے کے درپے ہوجائے۔ (فتاویٰ شیخ الاسلام، کتاب الطلاق)

ائمہ اربعہ کے اجتہادی اُصول

ائمہ اربعہ کے اجتہادی اُصول سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ وہ بنیادیں جن پر فقہی فروعات کا ذخیرہ مرتب ہوتا ہے۔یہ بنیادیں تمام مسالک کے ہاں من وجہٍ متحد ہیں، من وجہٍ مختلف ہیں۔اتفاق واتحاد کا پہلو یہ ہے کہ ہر امام کے ہاں اس بات کا التزام ہے کہ کوئی بھی فرعی مسئلہ کسی دلیل اور بنیاد کے بغیر اپنی طرف سے

بیان نہ کیا جائے۔ اگر کسی بھی شخص نے بلا دلیل اور بے بنیاد کوئی جزئیہ گھڑا اور لوگوں کو اس مسئلہ کی اتباع کی دعوت دی تو یہ شرعاً واخلاقاً جرم ہے۔ فقہاء کا یہ جملہ معروف ہے کہ: ''**لا یجوز لأحد أن کان یقول بقولنا حتی یعلم من أین قلنا**''۔ (الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، تقلید، حکم التقلید، حکم التقلید فی الفروع، ج:۱۳، ص:۱۶۱)

اب فقہاء کرام کے فقہی قول کا ماخذ کیا ہے؟! اس بارے میں بھی تقریباً اتفاق پایا جاتا ہے کہ قرآن وسنت، اجماعِ اُمت اور قیاسِ شرعی، یہ اتفاقی مآخذ ہیں۔ ائمہ اربعہ نے اپنے بیشتر فقہی مسائل ان ہی چار چشموں سے حاصل کیے ہیں، اس لیے ان چار بنیادوں پر قائم فروع کسی بھی مسلک کے فقہی ذخیرہ کا حصہ ہوں انہیں اُصولی اختلافی مسائل سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، ان مآخذ کی مثال مقررہ پیمانوں کی ہے۔ فقہاء کی مثال ان پیمانوں کے مظروف سے اپنے دامن بھرنے والوں کی ہے، ان پیمانوں سے جس نے جو لیا حکماً وہ سب ایک ہی ہے۔ فرق صرف ظرف کا ہے، مظروف سب کا ایک ہی ذخیرہ سے اُٹھایا ہوا ہے۔

ہاں! اتنا ضرور ہے کہ ان مآخذِ اربعہ سے جو ظروف بھرے گئے ہیں، اُن کی وسعت، حجم اور گنجائش ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتی ہے: کوئی کشادہ اور گہرا ہے (حنفی)۔ کوئی کشادہ دہن ہے، مگر عمق نہیں ہے (مالکی)۔ کسی کا عمق کم ہے، مگر ظاہری وسعت پائی جاتی ہے (شافعی)۔ کسی کا ظرفِ حاوی صرف ظاہری پھیلاؤ رکھتا ہے (حنبلی)۔ ان برتنوں کی ساخت کے اس اختلاف کی بدولت ان کی بھرائی بھی مختلف ہوگی، یہ اختلاف ہے، اس کو اختلاف کہہ سکتے ہیں، اسی اختلاف کو ان کا مآخذِ اتفاقیہ سے استفادے کی نوعیت وکمیت کا اختلاف بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہاں! یہ بات وہاں تک درست ہوگی، جہاں تک اختلاف کی بنیاد اِن دلائل میں سے کسی دلیل کے اختلاف پر مبنی نہ ہو، اگر اختلاف ناشئ عن الدلیل ہو تو اسے استفادے کی نوعیت کا اختلاف کہنے کے بجائے ترجیحِ دلیل واختیارِ دلیل کا اختلاف کہا جائے، جیسے: کفارات میں ''رقبۃ'' کے ''مؤمنۃ'' ہونے کی قید کا اختلاف بعض مواقع کے اطلاق وتقیید کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، یا سنت میں نافی اور مثبت کا اختلاف ہے اور دونوں روایتیں قابلِ اعتبار ہیں، تو اس اختلاف کو اختلاف کے بجائے عمل بالدلیل کہنا زیادہ موزوں ہے، اس موقع پر کسی کا رجحان ترجیح ہے اور کسی کا میلان تطبیق وتوفیق کا ہے، لیکن ترکِ سنت کی طرف کوئی نہیں جاتا، جس نے جس روایت کو اختیار کیا اس نے سنت کی حجیت کے اعتقاد کی بنیاد پر ہی اُسے لیا، اسے اختلاف کے بجائے عمل بالسنۃ کہنا چاہیے۔

منصوص اور غیر منصوص مآخذ

مسائل کے دلائل اور مآخذ کے ضمن میں ایک بات یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فقہی دلائل کی معروف ترتیب وتقسیم کے علاوہ ایک اور تقسیم بھی ہے، جسے منصوص دلائل اور غیر منصوص دلائل کی تقسیم

سے پہچانا جاتا ہے، منصوص دلائل سے مراد کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ، شرائع من قبلنا اور آثارِ صحابہؓ (بالخصوص جو خلافِ قیاس ہوں ان کی حیثیت مرفوع روایت کی ہوتی ہے) ہیں۔ ''آیات الاحکام'' کی تعداد ۲۵۰ سے لے کر ۵۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ قرطبی اور مظہری میں فقہی ذوق کے تحت تفسیر کی گئی ہے، جس کی وجہ سے آیاتِ احکام کا عدد مخصوص نہیں رہتا۔ اسی طرح ''احادیث الاحکام'' کی تعداد بھی ۵۰۰۰ سے لے کر ۸۰۰۰ تک بتائی جاتی ہے۔ ''**الإلمام لأحاديث الأحكام**'' ابن دقیق العیدؒ، ''**بلوغ المرام من أدلة الأحكام**'' ابن حجر عسقلانیؒ [۷۷۳ھ-۸۵۲ھ]، اور ''**إعلاء السنن**'' شیخ ظفر احمد عثمانیؒ، اس موضوع کی معروف ومتداول کتابیں ہیں۔

شرائعِ سابقہ میں سے وہ احکام جو نفیاً یا اثباتاً ہمارے لیے واضح کردیئے گئے ہیں، اُنہیں اپنی شریعت کی وضاحت کے مطابق ترک یا اختیار کرنا خود ہماری شریعت کا عمل کہلائے گا۔ جہاں سابقہ شریعتوں کا کوئی حکم مذکور ہو اور اس کی وضاحت ہماری شریعت میں نہ ہو، احناف اس سکوت کے موقع کو تقریر قرار دیتے ہیں اور اس حکم کے باقی ہونے کے قائل ہیں۔ دوسری رائے امام شافعیؒ وغیرہ کی ہے کہ ایسا حکم زندہ و باقی شمار نہیں کیا جائے گا۔ الغرض اس حجیت کے اختلاف کی وجہ سے اگر ائمہ کے درمیان اختلاف ہو تو اسے دلیل پر مبنی اختلاف کہہ سکتے ہیں، مگر نفس الامر میں اس اختلاف کی مثالیں بالعموم دستیاب نہیں، یہ ایسا اُصولی اختلاف شمار ہوگا جس کی خارج میں فروع کمیاب ہیں۔

آثارِ صحابہؓ کی حجیت مستقل موضوع یا دینی ضرورت ہے، یہاں یہ سمجھنا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے وہ اقوال جن میں بظاہر اجتہاد اور قیاس کا دخل نہیں ہے، ایسے آثار حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں حجت اور دلیل شمار کیے جاتے ہیں، انہیں مرفوع حدیث کے حکم میں سمجھا جاتا ہے۔ ایسے آثار کو جب شخصی اجتہاد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا تو اس کا مرفوع ہونا متعین ہوگا، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی طرف سے شرعی امور میں رائے زنی کرنے والے نہیں تھے، البتہ شافعیہ اور حنابلہ آثارِ صحابہؓ کو فی الجملہ حجت نہیں مانتے۔ بہت سارے اختلافی مسائل آثارِ صحابہؓ کی حجیت کے اعتبار و عدمِ اعتبار کے اصول پر متفرع ہوئے ہیں۔ جنہوں نے نہیں مانا ان کے فروع کم تر رہ گئے۔ اسے فروع کا تفاوت کہیں یا اختلاف کہیں، بہرحال فقہ کی آراء کے تنوُّع کی ایک بڑی وجہ بن گئے۔

غیر منصوص فقہی دلائل

غیر منصوص فقہی ادلہ سے مراد فقہِ اسلامی کی وہ بنیادیں ہیں جو فقہاءِ اُمت کے اتفاق، استنباط اور اجتہاد کے نتیجے میں وجود پذیر ہوئی ہوں اور ان پر فقہی مسائل کی بنیاد رکھی گئی ہو، ظاہر ہے اجتہاد و استنباط میں فطری تفاوت اور تنوُّع ناقابلِ انکار امر ہے، اسی کے بارے میں ابن قدامہ حنبلی رحمہ اللہ کا

ارشاد ہے: ''**اتفاقھم حجة قاطعة و اختلافھم رحمة واسعة.**'' (المغنی، خطبۃ الکتاب، ج:۱، ص:۲، ط: ادارۃ البحوث العلمیۃ) اتفاق کی مثال اجماع ہے، اجماع کی صورت میں اختلاف ہی نہیں رہا، باقی استنباطی واجتہادی جو بنیادیں ہیں ان پر متفرع ہونے والے مسائل کو اختلافی کہا جاسکتا ہے، اسے اختلاف کہیں یا وسعت، محض تعبیری فرق ہوگا۔ غیر منصوص اجتہادی بنیادیں یہ ہیں:

قیاس	استحسان	مصالح مرسلہ	استصحاب
ذریعہ	عرف وعادت	تعاملِ خاص/ تعاملِ اخیار	

ان فقہی بنیادوں، اصولوں اور دلیلوں میں سے استحسان اور مصالحِ مرسلہ احناف و مالکیہ کے ہاں حجت ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف اس کے برعکس ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں استصحاب کا اعتبار ہے، سدِ ذریعہ وفتحِ ذریعہ کے بارے میں احناف و مالکیہ حجیت کے قائل ہیں۔ مالکیہ زیادہ توسُّع سے کام لیتے ہیں، عرف وعادت کا سب ہی اعتبار کرتے ہیں، مگر احناف کے ہاں زیادہ وسعت پائی جاتی ہے۔

اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ان کے تلامذہ کے متوارث عمل کو ترجیح دیتے ہیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کے اور اہلِ مدینہ کے تعامل کو فوقیت دیتے ہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مولود مکہ ہیں تو وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ کے تعامل کو اہمیت دیتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ چونکہ عمل بالظاہر کو پسند کرتے ہیں تو انہوں نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم کی روایات کو مرغوب جانا جو اُن کے ذوق کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتے تھے، جیسے: حضرت ابوہریرہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہم۔ بنابریں جب مسائل کی بنیاد ان اُصولوں پر ہوگی تو فروع کا تنوُّع وتفاوت یقینی طور پر پایا جائے گا۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

تفصیلِ بالا کی روشنی میں کافی حد تک یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ ائمہ کے اقوال اور آراء کے تنوُّع کا بنیادی سبب دو اُمور کو قرار دیا جاسکتا ہے: ایک اتفاقی ماخذ سے استفادے کی نوعیت کا اختلاف، دوسرا سبب ذیلی ماخذ کا اعتبار اور عدمِ اعتبار ہے۔ اس کے بعد اجتہادی اصول کی انفرادی تفصیل کی حاجت تو نہیں ہے، البتہ اختصار کے ساتھ عرض کردیتے ہیں، ممکن ہے کسی طالب علم کے لیے ضبط میں معاون ثابت ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی واستنباطی اصول

● امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور ارشاد ہے کہ میں قرآن کریم سے مسئلہ کا حکم دریافت کرتا ہوں، اگر قرآن میں نہ ملے تو سنتِ رسول اللہ (ﷺ) سے لیتا ہوں، اگر سنت میں نہ ملے تو اقوالِ صحابہؓ

کی طرف جاتا ہوں، اس کے بعد کسی کے قول کی طرف نہیں جاتا۔ ابراہیم نخعیؒ، ابن سیرینؒ، ابن مسیّبؒ ؒ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ کے اقوال کو لینے کے بجائے ان کی طرح اجتہاد کرتا ہوں۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اجتہاد میں قیاسِ جلی اور قیاسِ خفی (استحسان) دونوں سے استفادہ کرتے ہیں۔

● دلائل کے درمیان درجہ بندی کا لحاظ بھی آپ کا خاص وصف تھا۔ اخبارِ آحاد کو کتاب اللہ کے بعد رکھتے تھے، جس سے بعض ظاہر بینوں کو مغالطہ لگتا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ قیاس کے لیے اخبارِ صحیحہ کو ترک کردیتے ہیں، حالانکہ وہ ترکِ قیاس کی وجہ سے نہیں، بلکہ کتاب اللہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

● امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ متعارض ومتفاوت روایات کے درمیان ترجیح کے بجائے تطبیق وتوفیق کو اہمیت دیتے ہیں۔ ترجیح میں ایک روایت کا ترک لازم آتا ہے اور تطبیق میں ہر ایک روایت کو معمول بنانے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

● امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اخبار کے قبول وترک کرنے کے لیے ۱۶ اُصول وشرائط منقول ہیں، ان کی وجہ سے بہت سارے احکام امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں اخبار سے ثابت نہیں ہو سکے اور دیگر ائمہ کے ہاں ثابت ٹھہرے، اس لیے اُصولِ روایت اور اُصولِ درایت کی بنا پر وہ طرقِ اجتہاد سامنے آئے جو دیگر ائمہ کے نہیں تھے۔ اس کی تفصیل علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کے اس تقدیمی مقالہ میں دیکھی جاسکتی ہے جو آپ نے ''نصب الرایۃ'' کے لیے لکھا تھا اور ''فقه أهل العراق و حديثهم'' (ص:۲۷، ط: ایچ .ایم .سعید کراچی) کے نام سے مستقل طور پر بھی مطبوع ہے۔

● نیز تعامل کے باب میں امام صاحبؒ حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور اہلِ کوفہ کے تعامل کو ترجیح دیتے ہیں۔

امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اصول

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے تین بنیادی اُصول ہیں:

۱:-کتاب اللہ ۲:-سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ۳:-تعاملِ اہلِ مدینہ

البتہ سنت اور تعاملِ اہلِ مدینہ میں اس تفصیل کے ساتھ اجتہاد فرماتے ہیں کہ سنت میں متصل روایات کو اولین ترجیح دی جاتی ہے، پھر مراسیل کو لیتے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قضایا، پھر عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فتاویٰ، پھر مدنی صحابہؓ کے فتاویٰ، اس کے بعد مدینہ کے فقہاء سبعہ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ اور قضایا کو اہمیت دیتے ہیں۔ (الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف، ص:۶۷، ط: دار الکتب، بیروت)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول

دیگر ائمہ کے مقابلہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصولِ اجتہاد زیادہ منضبط ہیں، انہوں نے اپنے

اُصول وفروع خود مرتب فرمائے ہیں، ان کے اصول کی کتاب ’’الرسالۃ‘‘ معروف ہے۔ آپ کے ہاں بھی تین اُصول بنیادی ہیں:

۱:- استمداد من الکتاب ۲:- استخراج من السنۃ/عمل بالسنۃ ۳:- تعامل اہلِ مکہ

سنت اور حدیث کے ظاہری مدلول پر عمل کے لیے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ حریص تھے، آپ سنت کو قرآن کی شرح اور بیان قرار دیتے تھے، جیسے اصول فقہ میں ملتا ہے کہ آپ موقع بہ موقع سنت/ اخبار آحاد کو قرآن کریم کے الفاظ کے معانی قرار دیتے تھے، جو حنفیہ کے نزدیک بسا اوقات اخبار آحاد اور کتاب اللہ کے درمیان مساوات پر منتہی ومنتج ہوجاتا تھا، جس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ آپ نے اخبار آحاد کی حجیت پر اتنا زور دیا ہے کہ انہیں عملاً متواتر کے قریب قرار دیا تھا۔ (الإنصاف فی بیان أسباب الاختلاف، ص:۴۳، ط: دار الکتب، بیروت)

نیز مراسیل کے حجت ہونے کے بارے میں آپ کے اقوال مضطرب رہے۔ بالآخر سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ جیسے حضرات کی مراسیل کو حجت ماننے پر مجبور ہوگئے۔ (فقہ اہل العراق وحدیثہم، ص:۳۳، ط: سعید)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اجتہادی اُصول پانچ شمار کیے جاتے ہیں:

۱:- ظاہر نصوص۔

۲:- صحابہ رضی اللہ عنہم کے اتفاقی فتاویٰ یا جن کا خلاف منقول نہ ہو۔

۳:- اختلافِ صحابہؓ کی صورت میں جو فتویٰ قرآن وسنت کے زیادہ قریب ہو۔

۴:- اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صریح فتویٰ نہ مل سکے تو حدیثِ مرسل نیز ضعیف حدیث کو بھی لے لیتے ہیں، بشرطیکہ وہ شدید الضعف ومنکر نہ ہو۔

۵:- جب کوئی نص اور سلف کا قول نہ ملے تو پھر قیاس سے کام لیتے ہیں، لیکن ایسا بامرِ مجبوری ہی کرتے ہیں، جہاں نص یا قولِ سلف نہ ملے وہاں زیادہ تر سکوت اختیار فرماتے ہیں، رائے سے اجتناب فرماتے ہیں۔ (اعلام الموقعین، ج:۱،ص:۲۳، ط: دار الحدیث)

یہ چند اشارات تھے جو اپنے مبیّنہ عنوان سے متعلق درج کردیئے گئے ہیں، باقی فقہ، اُصولِ فقہ کی تدریس اور ائمہ کے اجتہادی اُصول کی بابت اسلاف کے بحورِ علمیہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آئندہ نسلوں کو ان ذخائرِ علمیہ سے استفادے کی توفیق دے۔ آمین (انتہٰی)

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

شرعی عائلی احکام کی دفعہ بندی:

مفتی شعیب عالم
اُستاذ ومفتی دارالافتاء جامعہ

متن قانونِ ثبوتِ نسب (تیسری قسط)

بابِ ششم

بینہ

دفعہ۲۳۔ثبوت نسب بذریعہ بینہ:

(۱) پدری، مادری، فرزندی اور برادرانہ قرابت کو دو عادل مردوں یا ایک عادل مرد اور دو عادل عورتوں کی شہادت سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

(۲) پدری رشتہ کو کسی دوسرے حق کے ضمن میں شامل کیے بغیر براہ راست ثابت کیا جاسکتا ہے، جب کہ مدعی علیہ حیات اور حاضر ہو۔

اگر مدعی علیہ حیات نہ ہو تو قرابت کا اثبات کسی دوسرے حق کے ضمن شامل کیے بغیر ممکن نہیں۔

(۳) اخوت اور عمومت وغیرہ دور کی قرابتوں کو بہرصورت کسی دوسرے حق کے ضمن میں ثابت کیے جانا ضروری ہے۔

دفعہ۲۴۔شہادت کے ذریعہ نقضِ نسب:

ثبوتِ نسب اگر بذریعہ بینہ ہو اور مجاز عدالت اس کی ڈگری بھی صادر کرچکی ہو تو بھی مخالف شہادت کے ذریعے اس کا نقض جائز ہے۔

دفعہ۲۵۔تسامع کی بناپرشہادتِ نسب:

اگر کسی کا نسب عام لوگوں میں مشہور ومعروف ہو تو اس کے نسب کی گواہی دینا جائز ہے۔

باب ہفتم

عمومی احکام

دفعہ ۲۶۔ زنا سے عدم ثبوتِ نسب:

زنا سے ثبوت نسب نہ ہوگا، اگرچہ مرد وعورت اس کا اقرار کرتے ہوں، مگر یہ کہ زانی زنا کی تصریح کیے بغیر نسب کا دعوی کرے۔

دفعہ ۲۷۔ حاملہ مزنیہ سے ثبوتِ نسب:

(۱) کسی عورت کو زنا سے حمل قرار پائے اور پھر زانی اسی مزنیہ سے نکاح کرے اور نکاح سے چھ ماہ یا اس سے زیادہ مدت میں بچہ تولد ہوتو وہ ثابت النسب قرار پائے گا اور شوہر کو نسب کی نفی کا حق نہ ہوگا۔

(۲) اگر بچے کی ولادت نکاح کے بعد چھ ماہ سے پیشتر ہوتو شوہر سے اس کا نسب ثابت نہیں قرار پائیگا بجز یہ کہ شوہر ثبوت نسب کا دعوی کرے اور یہ صراحت نہ کرے کہ بچہ زنا کے تعلق کے باعث کے تولد ہوا ہے۔

دفعہ ۲۸۔ نامعلوم النسب اور ولد الزنا مترادف تعبیریں نہیں:

جوشخص ثابت النسب نہ ہو، ضروری نہیں کہ وہ ولد الزنا ہو۔

دفعہ ۲۹۔ متبنّٰی کی تعریف:

کوئی معروف النسب یا مجہول النسب شخص جس کو اس کے حقیقی والد کے علاوہ کسی اور نے حقیقی اولاد کی طرح بنالیا ہو، متبنّٰی کہلاتا ہے۔

دفعہ ۳۰۔ متبنّٰی کا حکم:

متبنّٰی کو حقیقی اولاد کا درجہ دینا از روئے شرع باطل ہے، لہٰذا متبنّٰی اور متبنی کے ایک دوسرے پر پدری اور فرزندی کے حقوق وفرائض واجب نہ ہوں گے اور دونوں کا تبنّیت سے قبل کا رشتہ برقرار رہے گا۔

دفعہ ۳۱۔ ثبوتِ نسب میں قبضہ اور بینہ میں سے کون سا مقدم ہے:

الف۔ ایک شخص اپنے زیرِتحویل بچے کے نسب کا مدعی ہے، مگر دوسرا شہادت قائم کرلیتا ہے تو دوسرے کا حق برتر ہے۔

ب۔ اگر دونوں گواہ قائم کرلیں تو قابض کا حق مقدم ہے۔

ج۔ اگر ایک کہے کہ فلاں عورت سے میرا بیٹا ہے اور دوسرا کہے کہ میرا بیٹا ہے تو اول الذکر کا حق فائق ہے۔

(جاری ہے)

حج سے متعلق قرآن کریم کی رہنمائی!

مولانا فخر الاسلام المدنی
اُستاذِ جامعہ

’’ثلاثیات‘‘ کی صورت میں سورۂ بقرہ کی چند آیات کے علمی فوائد

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يَاأُوْلِيْ الْأَلْبَابِ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّالِّيْنَ ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِيْ الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِيْ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِيْ الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ أُولٰئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ.‘‘ (البقرۃ:۱۹۷-۲۰۳)

ترجمہ:’’حج کے چند مہینے ہیں معلوم، پھر جس نے لازم کرلیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانہ میں اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے۔ اور زادِراہ لے لیا کرو کہ بے شک بہتر فائدہ زادِراہ کا بچنا ہے سوال سے اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو! کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے رب

کا۔ پھر جب طواف کے لیے لوٹو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے۔ اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا اور بے شک تم تھے اس سے پہلے ناواقف۔ پھر طواف کے لیے پھرو جہاں سے سب لوگ پھریں اور مغفرت چاہو اللہ سے، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان۔ پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ پھر کوئی آدمی تو کہتا ہے: اے رب ہمارے! دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ اور کوئی اُن میں کہتا ہے: اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے، انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں، پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو اس پر گناہ نہیں اور جو کوئی رہ گیا تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور جان لو بے شک تم سب اسی کے پاس جمع ہو گے۔‘‘

ان آیاتِ کریمہ میں حج سے متعلق ہدایات اور احکام ہیں، جن کا تعلق ۸؍ذوالحجہ سے لے کر ۱۳؍ذوالحجہ تک کے اعمال سے ہے، جن کے مفہوم کو ایک مخصوص انداز میں ’’ثلاثیات‘‘ کی صورت میں بیان کرنے کا ایک مقصد یہ ہے کہ اس کو ذہن نشین کرنا آسان ہو۔ علماء اور طلبہ کے لیے جہاں ان آیات میں نکتے اور فوائد کی نشاندہی ہے، وہاں عوام کے لیے حج سے متعلق مسائل اور آگاہی بھی ہے۔ حجاجِ کرام کے لیے موقع ہے کہ وہ ان آیاتِ کریمہ کے مفہوم کو دل و دماغ میں بٹھا کر حج کے قیمتی لحات سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہوں اور قرآن کریم کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھائیں۔ عام لوگوں سے گزارش ہے کہ وہ ان آیاتِ کریمہ کے معانی کو سمجھنے کی کوشش کریں، تاکہ مضمون کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ نیز تجربہ سے ثابت ہے کہ حج کے موقع پر ان آیات کی تلاوت کا ایک خاص لطف ہوتا ہے، وہ بھی معانی کو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

ذیل میں ہم جو فوائد (لفظی و معنوی) ذکر کر رہے ہیں، اکثر و بیشتر کا تعلق ان ہی آیاتِ کریمہ سے ہے جو اوپر مذکور ہیں، لیکن چونکہ مضمون حج سے متعلق ہے، اس لیے بعد میں مضمون کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے مطلق حج سے متعلق جتنے ثلاثی فوائد میسر آئے، اس مناسبت سے ان کو بھی شاملِ مضمون کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ طاق اعداد میں تین کا عدد دیگر فضیلتوں کے ساتھ ایک ایسا معتدل عدد ہے جس کے ذریعے سے کسی بھی سورت، آیت یا چند آیات یا حدیث کی تشریح و توضیح کو احاطہ کرنے میں

آسانی ہوتی ہے، اس سے پہلے سورۃ النمل میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے سے متعلق آیات کی اس طرز پر تشریح کی ہے جس کو علماء کرام نے بہت پسند کیا اور سراہا۔ اس مرتبہ قصہ کے بجائے ایسی آیات جو احکامِ شرعیہ میں سے کسی حکم سے متعلق ہوں کو اختیار کیا ہے، آگے چل کر اس سلسلے اور طریقے کو احادیثِ شریفہ میں بھی بروئے کار لائیں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ! اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم تین کے بجائے کسی اور عدد کا انتخاب کریں۔ آئندہ مضامین میں اس کی مثالیں آئیں گی، ان شاء اللہ العزیز! دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرما کر نافع بنادے۔

- عبادات کی تین قسمیں ہیں: ۱:- خالص بدنی عبادت، جیسے: نماز اور روزہ، ۲:- خالص مالی عبادت، جیسے: زکوۃ، ۳:- دونوں کا مجموعہ، جیسے: حج۔
- حج میں تین حروف ہیں: ح، ج، ج (کیونکہ مشدد حرف دو حرف کے قائم ہوتا ہے)
- پہلی آیت میں حج کا لفظ تین مرتبہ آیا ہے: ۱:- ''اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ''، ۲:- ''فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ''، ۳:- فَلاَ رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ'' (اس سے حج کی تینوں قسموں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے)
- معنوی لحاظ سے حج کے اس تکرار میں تین باتیں سامنے آئیں: ۱:- مدتِ حج: ''اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ''، ۲:- نیتِ حج: '' فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ''، ۳:- وقایتِ حج: (یعنی حج کا پرہیز) ''فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ.''
- حج کا لفظ تین اعراب کے ساتھ مذکور ہے: ۱:- مرفوع مبتدا: ''اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ''، ۲:- منصوب مفعول: '' فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ ''، ۳:- مجرور بحرف الجر: ''وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ'' (بعینہٖ اسی ترتیب: رفع، نصب، جر کے ساتھ)
- آیت میں مذکور ''أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ'' سے تین مہینے مراد ہیں: ۱:- شوال، ۲:- ذوالقعدہ، ۳:- ذوالحجہ۔
- آیت میں تین گناہوں سے خاص طور پر منع کیا گیا ہے: ۱:- ''فَلاَ رَفَثَ''، ۲:- ''وَلَا فُسُوْقَ''، ۳:- ''وَلَا جِدَالَ ''
- رفث کی تفسیر میں تین اقوال ہیں: ۱:- جماع، ۲:- کلامِ فاحش، ۳:- عورتوں کی موجودگی میں تذکرۂ جماع۔
- مذکورہ آیات تین مواقف اور مشاعر کے احکام پر مشتمل ہیں: ۱:- عرفات: ''ثُمَّ أَفِيْضُوْا

مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ ''،۲:-مزدلفہ: ''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ''،۳:-منیٰ: ''وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ''

● مجموعی طور پر ان آیاتِ کریمہ میں حج کے موقع پر تین قسم کے اعمال کثرت سے کرنے کا حکم ہے:۱:-ذکر: ''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ''،۲:-استغفار: ''وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''، ۳:-دعاء: ''رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً''

● مذکورہ اعمال کے حکم میں تین طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے:۱:-تاکید کے ساتھ، جیسا کہ ذکر،۲:-بلا تاکید صیغۂ امر کے ساتھ، جیسا کہ استغفار،۳:-بلا تصریح اشارے کے ساتھ، جیسا کہ دعا۔

● ذکر میں تاکید کی تین نوعیتیں ہیں:۱:-تکرارِ حکم،۲:-تشبیہ الحکم بذکر الآباء،۳:-اسم تفضیل کا صیغہ ''أَشَدَّ'': ''أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا''

● اور ''اُذْكُرُوا اللّٰهَ'' کا لفظ تین مرتبہ آیا ہے:۱:-''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ''،۲:-''فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ''،۳:-''وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ''

● دعاء والی آیت ''رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' تین چیزوں پر مشتمل ہے:۱:-دنیا کی بھلائی،۲:-آخرت کی بھلائی،۳:-جہنم سے خلاصی۔

● دعا کے اعتبار سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں:۱:-جو صرف دنیا مانگتے ہیں، قرآن نے ان کی مذمت کی ہے،۲:-جو صرف آخرت مانگتے ہیں، قرآن نے ان کا تذکرہ نہیں کیا،۳:-جو دنیا آخرت دونوں مانگتے ہیں، قرآن نے ان کی تعریف کی ہے: ''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ''

● اس دعا کو رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان پڑھنا مسنون عمل ہے، مگر اس میں تین جملوں کا اضافہ کیا جائے:۱:-''وَأَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْأَبْرَارِ،۲:-''يَا عَزِيْزُ''،۳:-''يَا غَفَّارُ''

● ان آیاتِ کریمہ میں تقویٰ کا حکم تین مرتبہ آیا ہے:۱:-''وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى''،۲:-''وَاتَّقُوْنِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ''،۳:-''وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ''

● ''وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى'' یہاں تقویٰ کے معنی میں تین احتمالات ہیں: ۱:-سوال سے بچنا،۲:-ترکِ معصیت،۳:-خوفِ خدا۔

● رفع الاثم والجناح (رخصت) کا ذکر تین مرتبہ آیا ہے:۱:-''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ''،۲:-''فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ''،۳:-''وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ''

● افاضۃ کا مادہ تین مرتبہ آیا ہے:۱:-''فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ''،۲:-''ثُمَّ أَفِيْضُوْا''،

۳:-’’مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ‘‘

● ’’أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘ سے ایامِ تشریق کے تین دن مراد ہیں: ۱:-گیارہویں، ۲:-بارہویں، ۳:-تیرہویں۔

● ’’وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘، ’’أیام معدودات‘‘ کا لفظ قرآن مجید میں تین مرتبہ آیا ہے: ’’يٰاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ‘‘ (البقرۃ) آگے فرمایا: ۱:-’’أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘، ۲:-’’وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘، ۳:-’’ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘ (آل عمران)

● علم کا مادہ تین مرتبہ استعمال ہوا ہے: ۱:-مفعول کے صیغہ کے ساتھ ’’أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ‘‘ ۲:-فعلِ مضارع کے ساتھ ’’وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ‘‘، ۳:-’’فعلِ امر کے ساتھ ’’وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ‘‘

● رب کا کلمہ تین مرتبہ استعمال ہوا ہے: ۱:-’’أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ‘‘، ۲:-’’فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا‘‘، ۳:-’’وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً‘‘

● مذکورہ آیات میں تین جگہ پر وعد (اُمید) کا ذکر ہے: ۱:-’’وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ‘‘، ۲:-’’وَاسْتَغْفِرُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ‘‘، ۳:-’’أُولٰئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا‘‘

● نیز تین آیات میں وعید ہے، ۱:-’’وَاتَّقُوْنِ يَاأُولِي الْأَلْبَابِ‘‘، ۲:-’’وَمَا لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ‘‘، ۳:-’’وَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ‘‘

● مذکورہ آیات توحید کی تینوں قسموں کو متضمن ہیں: ۱:-توحید الربوبیت، رازق اللہ ہے: ’’أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ‘‘ ۲:-۔توحید الالوہیت، دعا: ’’رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً‘‘ نیز حج خود عبادت ہے، جس سے توحیدِ الوہیت واضح ہے، ۳: ’’توحید الاسماء والصفات: ’’إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ‘‘

● مذکورہ آیات میں تینوں طرح کے فقہی احکام ’’من الأعلی إلی الأدنی‘‘ کی ترتیب پر موجود ہیں: ۱:-فرض: وقوفِ عرفہ ’’فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ‘‘، ۲:-واجب: وقوفِ مزدلفہ ’’فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ‘‘، ۳:-سنت: مبیتِ منیٰ ’’وَاذْكُرُوْا اللّٰهَ فِيْ أَيَّامٍ مَّعْدُوْدَاتٍ‘‘

● مذکورہ آیات میں زمانۂ جاہلیت کی تین چیزوں کی تردید اور نسخ کا حکم ہے: ۱:-قریش عرفات کے بجائے مزدلفہ سے واپس لوٹ جاتے تھے، ان کو منع کر دیا گیا: ’’ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ‘‘، ۲:-حج کے موقع پر عرب لوگ اپنے آباء واجداد پر فخر کرتے تھے، ان کو کہا گیا کہ بجائے تفاخرِ نسب کے اللہ کا ذکر کرو: ’’فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ‘‘، ۳:-لوگ حج کے موقع پر

صرف دنیا مانگتے تھے، ان کو منع کر دیا گیا: ’’فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ‘‘

● مذکورہ آیات میں تین غلط فہمیاں دور کی گئیں: ۱:- کچھ لوگ اپنے ساتھ زادِ راہ لینے کو توکل کے منافی سمجھتے تھے، ان کی حوصلہ شکنی کی گئی: ’’وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی‘‘، ۲:- کچھ لوگ حج میں تجارت کو اخلاص کے منافی سمجھتے تھے ان کو اجازت دی گئی: ’’لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ‘‘، ۳:- کچھ لوگ دنیا مانگنے کو عیب سمجھتے تھے، ان کی غلط فہمی دور کی گئی: ’’وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ‘‘

مطلق حج سے متعلق ثلاثیات بھی ملاحظہ فرمائیں

● حج کی تین اقسام ہیں: ۱:- اِفراد، ۲:- تمتع، ۳:- قران

● حج کے ارکان تین ہیں: ۱:- احرام، ۲:- وقوفِ عرفہ، ۳:- طوافِ زیارت۔

● بیت اللہ کے ارکان بھی تین ہیں: ۱:- رکنِ عراقی، ۲:- رکنِ شامی، ۳:- رکنِ یمانی۔

● حج کی فرضیت اور مفصل احکام قرآن مجید میں تین سورتوں میں مذکور ہیں: ۱:- سورۃ البقرۃ، ۲:- سورۂ آلِ عمران: ’’وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ‘‘، ۳:- سورۃ الحج۔

● طواف کی تین قسمیں ہیں: ۱:- طوافِ قدوم، ۲:- طوافِ زیارت یا طوافِ افاضہ، ۳:- طوافِ وداع۔ اور تینوں کے الگ الگ فقہی حکم ہیں: فرض، واجب، سنت۔

● بناءِ کعبہ کے مقاصد تین بیان کیے گئے ہیں: ۱:- ’’وَطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ‘‘، طواف والوں کے لیے: ۲: ’’وَالْعَاكِفِیْنَ‘‘، معتکفین کے لیے، ۳:- ’’وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ‘‘، نمازیوں کے لیے۔

● جو شخص عذر یا بیماری کی وجہ سے سر کے بال منڈانا چاہے، تو اس کو تین چیزوں میں سے ایک کا حکم دیا گیا ہے: ۱:- ’’ففدیة من صیام‘‘ ۲:- ’’أو صدقة‘‘ ۳:- ’’أو نسک‘‘ (قربانی)

● جو شخص قربانی (دمِ تمتع) کی استطاعت نہ رکھتا ہو، اس کو ایامِ حج میں تین روزے رکھنے کا حکم دیا ہے: ’’فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ‘‘، باقی بعد میں رکھنے ہیں۔ کل دس روزے ہیں۔

● جمرات: کنکریاں مارنے کی جگہیں بھی تین ہیں۔

● حلق کرنے والوں کے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ رحمت کی دعا مانگی ہے: ’’اللّٰهم اغفر للمحلقين ثلاثا‘‘

● رمل (کندھے اکڑا کر چلنا) صرف پہلے تین طواف میں مسنون ہے۔ واضح رہے رمل ہر

اس طواف میں ہے جس کے بعد صفا مروہ کی سعی ہو۔

- حجرِ اسود سے متعلق تین سنتیں ہیں: ۱:- اگر موقع ملے تو تقبیلِ حجرِ اسود (یعنی حجرِ اسود کا بوسہ) ۲:- ورنہ استلام (چھونا)، ۳:- یا پھر دور سے سلام کرنا۔
- حج کی فرضیت تین چیزوں سے ثابت ہوتی ہے: ۱:- کتاب اللہ ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً ''، ۲:- سنت: ''أيها الناس! إن اللّٰه عزوجل قد فرض عليكم الحج، فحجوا '' (مسند احمد)، ۳:- اجماعِ اُمت۔
- حج میں ہدی کے لیے تین قسم کے جانور جائز ہیں: ۱:- اونٹ، ۲:- گائے، ۳:- بھیڑ بکری۔

آخر میں آیاتِ کریمہ میں موجود عمومی فوائد پر ایک نظر

- حج کی فضیلت اور اس کی عظمت، پہلی آیت میں لفظِ حج کا بار بار تذکرہ سے اس کی طرف اشارہ ہے، حالانکہ ضمیر کا اعادہ کافی تھا۔
- اسلامی قمری تاریخ کی اہمیت کہ عبادتیں اسی کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔
- دین میں آسانی ہے: ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا ''، '' وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ''
- دین کی ایک عمومی شکل ہے، اس میں کسی قوم کے لیے خصوصیت کا اعتبار نہیں: ''ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ ''
- تجارت اخلاص کے منافی نہیں: ''أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ''
- حج کے اعمال میں ترتیب کی اہمیت: ''فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ''
- لفظِ افاضۃ سے حجاج کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، مستقبل کا احاطہ یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے۔
- دین میں اتباع کی اہمیت ہے: ''وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ ''
- سب سے بڑی نعمت ہدایت ہے، اس پر اللہ کا شکر کرنا چاہیے: ''وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ وَإِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّيْنَ ''
- اللہ تعالیٰ ستار ہے، اس لیے سیاقِ ذم میں ''وَمِنَ النَّاسِ ''فرمایا اور پورے قرآن کا یہی اسلوب ہے، حدیث میں بھی ایسے موقع پر ''ما بال قوم '' کے الفاظ استعمال ہوئے، کسی کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔
- دعا کا جامع ہونا مطلوب ہے: ''رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ''

● اعتدال ہر حال میں بہتر ہے، کچھ لوگ صرف دنیا مانگتے ہیں، کچھ آخرت، حالانکہ بہتر یہ ہے کہ آدمی دونوں مانگے۔

● ’’لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی‘‘،...انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کوشش کی۔ ’’اُولٰئِکَ لَھُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا‘‘.....’’ان کے لیے حصہ ہے ان کے اعمال کا۔‘‘

● عرب حسب ونسب پر تفاخر کرتے تھے: ’’کَذِکْرِکُمْ آبَاءَ کُمْ‘‘

فائدہ: عام طور پر آباء واجداد کو یاد کرنے کا مقصد قوت وغیرت کو بڑھانا تھا، جیسے کہ کہا گیا: ’’یَا اُخْتَ ھَارُوْنَ مَا کَانَ اَبُوْکِ امْرَأَ سَوْءٍ‘‘ چونکہ اللہ کو یاد کرنے سے اس سے کہیں زیادہ قوت وغیرت حاصل ہوجاتی ہے، اس لیے اللہ کا ذکر کرنے کا حکم دیا گیا اور تعصب سے منع کر دیا گیا۔

● بعض لوگوں کا اجر نقد دنیا میں ملتا ہے، آخرت میں ان کے لیے محرومی ہے: ’’وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ‘‘

● حرمین میں جس طرح نیکیوں کا اجر دگنا ہے، اسی طرح وہاں گناہ زیادہ خطرناک ہے: ’’فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ‘‘

● حج میں اخلاص خصوصی طور پر مطلوب ہے: ’’وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْہُ اللّٰہُ‘‘

● جس گناہ کا اندیشہ زیادہ ہو اس کی ممانعت خصوصی طور پر ملحوظ ہے، جیسے کہ حج میں رش کی وجہ سے لڑائی جھگڑے کی نوبت زیادہ آتی ہے، اس لیے اس سے خصوصی ممانعت کی۔

● واضح رہے کہ مدتِ صیام میں بھی ابتداءً مطلق رفث یعنی جماع سے منع کیا گیا ہے، جس طرح حج کی ان آیتوں میں منع کیا گیا ہے، پھر اس کی رات کے وقت اجازت مل گئی: ’’اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَاءِکُمْ‘‘ نیز اعتکاف میں بھی رفث یعنی جماع سے منع کیا گیا ہے: ’’وَلَا تُبَاشِرُوْھُنَّ وَاَنْتُمْ عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِدِ‘‘

● سورۂ بقرہ میں سب ارکان اسلام کا ذکر ترتیب سے موجود ہے، پہلی پانچ آیات میں ایمان، نماز، زکاۃ اور دوسرے پارہ میں روزہ، اور پھر انہی آیات میں حج کا ذکر ہوا جو ترتیب کے لحاظ سے ویسے بھی آخر میں ہے۔

● عرفات کا ظاہری منظر قیامت کے محشر کو یاد دلانے کی ایک صورت ہے، آیات کا اختتام ’’وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ‘‘ پر کیا گیا۔ مناسبت واضح ہے۔

● ذکر سے خاص طور پر تلبیہ (جو عام حالت میں ہوتا ہے)، تکبیر، تہلیل مراد ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر سے متعلق اہم توضیح

مولانا محمد عبدالحمید تونسوی
نواسہ حضرت مولانا عبدالستار تونسوی رحمۃ اللہ علیہ

اہلِ اسلام کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے بغیر باپ کے پیدا فرمایا اور انہیں سولی پر نہیں چڑھایا گیا، بلکہ زندہ ہی آسمانوں پر اُٹھالیا گیا، قیامت کے قریب وہ آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، چالیس یا پینتالیس برس زمین پر رہیں گے، پھر اُن کا انتقال ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک میں دفن ہوں گے۔

متعدد روایات میں یہ مضمون وارد ہے کہ اسی حجرۂ مبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی تین قبورِ مبارکہ کے ساتھ چوتھی قبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی ہوگی اور وہ روزِ حشر انہی کے ساتھ محشور ہوں گے۔

ا:......حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ینزل عیسی بن مریم إلی الأرض فیتزوج ویولد لہٗ ویمکث خمسا وأربعین سنة ثم یموت ، فیدفن معي فی قبري، فأقوم أنا وعیسی بن مریم فی قبر واحد بین أبی بکرؓ وعمرؓ۔'' (مشکوۃ، رقم الحدیث: ۵۵۰۸۔ وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ لابن جوزی، باب لاینبغی رفع الصوت فی المسجد: ۳۲۵/۲ بحوالہ کنز العمال للہندیؒ۔ شرح مشکاۃ للطیبی الکاشف عن الحقائق للسنن، کتاب الفتن باب نزول عیسیٰ: ۳۴۸۰/۱۱۔ مرقاۃ شرح مشکوۃ: ۳۴۹۶/۸، تحفۃ الاحوذی، کتاب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی: ۶۲/۱۰۔ المواہب اللدنیہ: ۳۸۲/۲۔ زرقانی علی المواہب: ۲۹۶/۸...۔''ویدفن عیسی ابن مریم ؑ مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی روضتہ ....الخ'' (علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ) مختصر تذکرۃ القرطبی: ۱۷۵، طبع مصر)

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام (قربِ قیامت میں آسمان سے) زمین پر اُتریں گے تو وہ نکاح کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی، دنیا میں ان کی مدتِ قیام (تقریباً) پینتالیس (۴۵) برس ہوگی، پھر اُن کی وفات ہوجائے گی اور وہ میری قبر یعنی میرے مقبرہ میں میرے پاس دفن

کیے جائیں گے (چنانچہ قیامت کے دن) میں اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام دونوں ایک ہی مقبرہ سے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے درمیان اُٹھیں گے۔''

۲:......حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

''مَکْتُوبٌ فِي التَّوْرَاةِ صِفَةُ مُحَمَّدٍ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ يُدْفَنُ مَعَهُ قَالَ: فَقَالَ أَبُو مَوْدُودٍ: وَقَدْ بَقِيَ فِي الْبَيْتِ مَوْضِعُ قَبْرٍ، هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔'' (ترمذی، ابواب المناقب، رقم الحدیث: ۳۶۱۷۔ قصص القرآن للسیوہاروی: ۳۹۶/۴، طبع: دار الاشاعت کراچی)

''تورات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف مذکور ہیں (ان میں یہ بھی ہے) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ کے ساتھ دفن کیے جائیں گے۔''

۳:......حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنے آباء واجداد سے روایت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''يُدْفَنُ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلّٰى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَصَاحِبَيْهِ فَيَكُوْنُ قَبْرُهُ الرَّابِعُ۔'' (معجم الکبیر للطبرانی، رقم الحدیث: ۳۸۴)

۴:......ایک موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اسی مقام پر اپنے لیے تدفین کی خواہش ظاہر کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ:

''قَالَ: وأنى لک ذٰلک الموضع مَا فِيهِ إلَّا قَبْرِي وقبر أبي بكر وَعمرؓ، وَفِيهِ عِيسَى بن مَرْيَم عَلَيْهِمَا الصَّلَاة وَالسَّلَامُ.'' (عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج: ۸، ص: ۲۲۸)

''تیرے لیے یہ کہاں ممکن ہے؟ اس مقام پر تو صرف میری اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کی قبریں ہوں گی اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام بھی اسی جگہ مدفون ہوں گے۔''

۵:......حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''روضۂ اقدس میں ایک قبر کی جگہ موجود ہے، اس میں عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام دفن ہوں گے۔'' (اخبارِ مدینہ: ۱۳۵)

۶:......حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت عیسیٰ علیہ السلام [دوبارہ آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے] اس کے بعد آپ کی وفات ہو جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر میں چوتھی قبر آپ کی ہوگی۔'' (ختم نبوت: ۲۷۶، بحوالہ الاشاعۃ للبرزنجی، رقم الحدیث: ۵۵)

☆......حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ [اہلِ اسلام کے اجماعی عقیدہ کی وضاحت

میں] لکھتے ہیں کہ:

''یہودیوں کا یہ کہنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول ومصلوب ہوکر دفن ہوگئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۂ نساء کی آیت: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ''میں واضح کردی ہے اور اس آیت میں بھی ''وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ''.....نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول ومصلوب تو ہوگئے، مگر پھر دوبارہ زندہ کرکے آسمان پر اُٹھالیے گئے۔ مذکورہ آیت میں ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کردی اور بتلادیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کرکے خوشیاں منارہے تھے، اس سے یہ دھوکہ عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰؑ ہیں، اس لیے ''شُبِّهَ لَهُمْ '' کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہوگئے۔ ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لیے آسمان پر زندہ اُٹھالیا۔ نہ ان کو قتل کیا جاسکا، نہ سولی پر چڑھایا جاسکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قربِ قیامت میں آسمان سے نازل ہوکر یہودیوں پر فتح پائیں گے اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔'' (معارف القرآن، ج:۲،ص:۷۸-۷۹)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی عقیدہ پر تمام اُمتِ مسلمہ کا اجماع نقل کیا ہے۔ (تلخیص الحبیر :۳۱۹)

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملہ میں متواتر ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبلِ قیامت نازل ہونے کی خبر دی ہے۔ (نووی شرح مسلم، ج:۲،ص:۴۰۳۔ تفسیر ابن کثیر: تحت آیت: ''وَإِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ'' ۴۳:۶۱) نیز عصرِ حاضر کے علمائے عرب کا فیصلہ بھی اسی کے موافق ہے:

''ذهب أهل السنة والجماعة إلى أن المسيح عيسٰى عليه الصلوة والسلام لم يزل حياً، وأن اللّٰه رفعهٗ إلى السماء وأنهٗ سينزل آخر الزمان عدلاً يحكم بشريعة نبينا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ويدعوا إلى ماجاء به من الحق ، وعلى ذٰلك دلت نصوص القرآن والأحاديث الصحيحة.'' (فتاویٰ علماء البلد الحرام،ص:۶۰ ۴،طبع: ریاض سعودی عرب)

مگر دورِ حاضر کے متجدد جاوید احمد غامدی صاحب کا بیان یہ ہے کہ:

''سیدنا مسیح کے بارے میں جو کچھ قرآن سے میں سمجھ سکا ہوں، وہ یہ ہے کہ ان کی روح قبض کی گئی اور اس کے فوراً بعد ان کا جسد مبارک اُٹھالیا گیا تھا کہ یہود اس کی بے حرمتی نہ کریں۔ یہ میرے نزدیک ان کے منصبِ رسالت کا ناگزیر تقاضا تھا۔'' (ماہنامہ اشراق:۴۵،اپریل ۱۹۹۵ء)

قارئین کرام! غامدی صاحب کا مذکورہ خودساختہ نظریہ کتاب وسنت کے سراسر خلاف اور اُمتِ مسلمہ کے اجماعی عقیدہ سے متصادم ہے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور ان کے نزول کا عقیدہ کتاب اللہ کے واضح حکم اور احادیثِ متواترہ سے ثابت ہے، جس کا انکار کفر ہے۔(دیکھئے! ہمارا رسالہ ’’غامدی صاحب کا منہج فکر‘‘: ۵۵-۵۶)

امام ابوداوٴد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے میں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کیا گیا وہاں ایک قبر کی جگہ خالی ہے۔ اس میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو دفن کرنے پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی راضی تھیں، لیکن بنوامیہ مانع ہوئے۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دفن کرنے پر بھی آپ راضی تھیں، لیکن انہیں وہ جگہ نہ ملی، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا کہ آپ کو یہاں دفن کریں گے، مگر اس پر بھی وہ راضی نہ ہوئے، بلکہ دوسری ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے ساتھ جنت البقیع میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو دفن کیا گیا۔ شاید ان سب کاموں میں یہ حکمت تھی کہ یہ جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کے لیے ہوگی۔(اشعۃ اللمعات، ج:۴،ص:۳۷۶۔ مرقاۃ شرح مشکوۃ، ج:۸،ص:۳۴۹۶،تحت رقم الحدیث:۵۵۰۸)

’’(وقد بقي في البيت) أی فی حجرة عائشةؓ (موضع قبر) فقيل بينهٗ صلی اللّٰه عليه وسلم وبين الصديقين وهو الأقرب إلى الأدب، وقيل بعد عمرؓ وهو الأظهر، فقد قال الشيخ الجزري: وكذا أخبرنا غير واحد ممن دخل الحجرة، ورأى القبور الثلاثة على هٰذه الصفة النبي صلى اللّٰه عليه وسلم مقدم، وأبوبكرؓ متأخر منه رأسهٗ تجاه ظهر النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ورأس عمرؓ كذٰلك من أبی بكرؓ تجاه رجلي النبي صلى اللّٰه عليه وسلم وبقي موضع قبر واحد إلى جنب عمرؓ وقد جاء أن عيسٰى عليه السلام بعد لبثه فی الأرض يحج ويعود، فيموت بين مكة والمدينة، فيحمل إلى المدينة فيدفن فی الحجرة الشريفة إلى جنب عمرؓ، فيبقى هٰذان الصحابيان الكريمانؓ مصحوبين بين هٰذين النبيين العظيمين عليهما الصلاة والسلام، ورضي اللّٰه عنهما إلٰى يوم القيامة . (رواه الترمذی) ۔‘‘

’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ (جگہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیقینؓ (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کے درمیان ہے اور یہی قول ادب کے زیادہ مناسب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ (وہ خالی جگہ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قبر کے بعد ہے، اور یہ قول زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ شیخ جزریؒ فرماتے ہیں کہ: حجرے میں داخل ہونے والوں اور تینوں قبور کی زیارت کرنے والوں میں سے بہت سے حضرات نے ہمیں یہی بتلایا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سب سے آگے ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سرمبارک نبی

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر مبارک کے سامنے ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قبر کے سامنے اسی کیفیت میں ہے (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سر مبارک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کمر مبارک کے سامنے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں مبارک کے سامنے ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔ اور (حدیث شریف میں) آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد حج بھی کریں گے اور واپس لوٹیں گے، پھر مکہ اور مدینہ کے درمیان وفات پائیں گے، پھر انہیں مدینہ لایا جائے گا، پھر انہیں حجرۂ شریفہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں دفن کیا جائے گا، چنانچہ یہ دو معزز صحابیؓ قیامت تک ان دو عظیم نبیوں کے درمیان ہوں گے۔''

(مرقاۃ شرح مشکوۃ، کتاب الفضائل، باب فضائل سید المرسلین صلوات اللہ وسلامہ علیہ، ج:۹،ص:۳۶۹۳)

''وأخرج الترمذي من حديث عبد اللّٰه بن سلام قال: مكتوب في التوراة صفة محمد وعيسى بن مريم عليهما السلام يدفن معهٗ، قال أبو داود: أحد رواته وقد بقي في البيت موضع قبر وفي رواية الطبراني يدفن عيسٰى مع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وأبي بكرؓ وعمرؓ فيكون قبرا رابعا۔'' (فتح الباری لابن حجر عسقلانیؒ، کتاب الفتن، باب ما ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱۳،ص:۳۰۸۔تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی، کتاب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱۰،ص:۶۲)

''ترمذیؒ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے، فرماتے ہیں کہ: توراۃ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدفون ہوں گے۔ اس حدیث کے راویوں میں سے ایک راوی ابوداؤد کہتے ہیں کہ: حجرۂ شریفہ میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔ طبرانیؒ کی روایت میں ہے کہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدفون ہوں گے تو یہ چوتھی قبر ہوگی۔''

مذکورہ دلائل و بینات سے جہاں یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر زندہ ہیں اور قربِ قیامت میں وہ آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے اور تقریباً پینتالیس سال زمین پر رہنے کے بعد ان کا انتقال ہوگا اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور میں حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدفون ہوں گے اور حجرۂ عائشہؓ میں چوتھی قبر آپؑ کی ہوگی، وہاں اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ منکرینِ ختمِ نبوت کا یہ دعویٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوچکی [نعوذ باللہ] اور ان کی قبر سرینگر [کشمیر] میں ہے، سراسر جھوٹ اور غلط ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

دنیا وآخرت کی کامیابی
سات [۷] صفات میں مضمر

ڈاکٹر مفتی محمد نجیب قاسمی سنبھلی
فاضل دارالعلوم دیوبند، انڈیا

سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ [۱۱] آیات میں مومنین کی بعض صفات کا ذکر کیا گیا جن کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

’’قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ أُولٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ.‘‘ (سورۃ المؤمنون:۱-۱۱)

’’ان ایمان والوں نے یقیناً کامیابی حاصل کرلی: جن کی نمازوں میں خشوع وخضوع ہے۔ جو لغو کاموں سے دور رہتے ہیں۔ جو زکوۃ کی ادائیگی کرتے ہیں۔ جو اپنی شرم گاہوں کی (اور سب سے) حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور ان کنیزوں کے جو اُن کی ملکیت میں آچکی ہوں، کیونکہ ایسے لوگ قابلِ ملامت نہیں ہیں۔ ہاں! جو لوگ اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگرانی رکھتے ہیں۔ یہ ہیں وہ وارث جنہیں جنت الفردوس کی میراث ملے گی، یہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

اللہ تعالیٰ - جو انس وجن اور تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے، جو خالق ومالک ورازقِ

کائنات ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، جو انسان کی رگ رگ سے ہی نہیں بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ سے اچھی طرح واقف ہے- نے انسان کی کامیابی کے لیے ان آیات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے علاوہ (۷) صفات ذکر فرمائی ہیں کہ اگر کوئی شخص واقعی کامیاب ہونا چاہتا ہے تو وہ دنیاوی فانی زندگی میں موت سے قبل ان سات اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرلے۔ان سات اوصاف کے حامل ایمان والے جنت کے اُس حصہ کے وارث بنیں گے جو جنت کا اعلیٰ و بلند حصہ ہے، جہاں ہر قسم کا سکون واطمینان وآرام وسہولت ہے، جہاں ہر قسم کے باغات، چمن، گلشن اور نہریں پائی جاتی ہیں، جہاں خواہشوں کی تکمیل ہے، جس کو قرآن وسنت میں جنت الفردوس کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔یہی اصل کامیابی ہے کہ جس کے بعد کبھی ناکامی، پریشانی، دشواری، مصیبت اور تکلیف نہیں ہے، لہٰذا ہم دنیاوی، عارضی ومحدود خوشحالی کو فلاح نہ سمجھیں، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی کے لیے کوشاں رہیں۔ایمان والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر تسلیم کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوئے۔انسان کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے، اس کے علاوہ انسان کی کامیابی کے لیے جو سات اوصاف اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ذکر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱:-خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کی ادائیگی

خضوع کے معنی ظاہری اعضاء کو جھکانے (یعنی جسمانی سکون) اور خشوع کے معنی دل کو عاجزی کے ساتھ نماز کی طرف متوجہ رکھنے کے ہیں۔خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم نماز میں جو کچھ پڑھ رہے ہیں اس کی طرف دھیان رکھیں اور اگر غیر اختیاری طور پر کوئی خیال آجائے تو وہ معاف ہے، لیکن جونہی یاد آجائے دوبارہ نماز کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوجائیں۔غرضیکہ ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ نماز کے وقت ہمارا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ ہم نماز کے کس رکن میں ہیں اور کیا پڑھ رہے ہیں۔اسی طرح ہمیں اطمینان وسکون کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ایک اور صاحب بھی مسجد میں آئے اور نماز پڑھی، پھر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: جاؤ نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔وہ گئے اور جیسے نماز پہلے پڑھی تھی، ویسے ہی نماز پڑھ کر آئے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آکر سلام کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جاؤ نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔اس طرح تین مرتبہ ہوا۔اُن صاحب نے عرض کیا: اُس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس

سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا، آپ مجھے نماز سکھائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، پھر قرآن مجید میں سے جو کچھ پڑھ سکتے ہو پڑھو، پھر رکوع میں جاؤ تو اطمینان سے رکوع کرو، پھر رکوع سے کھڑے ہو تو اطمینان سے کھڑے ہو، پھر سجدہ میں جاؤ تو اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدہ سے اُٹھو تو اطمینان سے بیٹھو۔ یہ سب کام اپنی پوری نماز میں کرو۔ (صحیح بخاری)

۲:- لغو کاموں سے دوری

لغو اس بات اور کام کو کہتے ہیں جو فضول، لایعنی اور لاحاصل ہو، یعنی جن باتوں یا کاموں کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ مولائے حقیقی نے اس آیت میں ارشاد فرمایا کہ: لغو کاموں کو کرنا تو درکنار اُن سے بالکل دور رہنا چاہیے۔ ہمیں ہر فضول بات اور کام سے بچنا چاہیے قطع نظر اس کے کہ وہ مباح ہو یا غیر مباح، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: انسان کا اسلام اسی وقت اچھا ہوسکتا ہے جبکہ وہ بے فائدہ اور فضول چیزوں کو چھوڑ دے۔ (ترمذی)

۳:- زکوٰۃ کی ادائیگی

انسان کی کامیابی کے لیے تیسری اہم شرط زکوٰۃ کے فرض ہونے پر اس کی ادائیگی ہے۔ زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز کے بعد سب سے زیادہ حکم زکوٰۃ کی ادائیگی کا ہی دیا ہے۔ سورۃ التوبہ آیت نمبر: ۳۴ - ۳۵ میں اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لیے بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے جو اپنے مال کی کماحقہٗ زکوٰۃ نہیں نکالتے، اُن کے لیے بڑے سخت الفاظ میں خبر دی ہے، چنانچہ فرمایا کہ: جو لوگ اپنے پاس سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اُس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو (اے نبی!) آپ اُن کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دیجئے، یعنی جو لوگ اپنا پیسہ، اپنا روپیہ، اپنا سونا چاندی جمع کرتے جارہے ہیں اور اُن کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، اُن پر اللہ نے جو فریضہ عائد کیا ہے اُس کو ادا نہیں کرتے، اُن کو یہ بتادیجئے کہ ایک دردناک عذاب اُن کا انتظار کررہا ہے۔ پھر دوسری آیت میں اُس دردناک عذاب کی تفصیل ذکر فرمائی کہ یہ دردناک عذاب اُس دن ہوگا جس دن سونے اور چاندی کو آگ میں تپایا جائے گا اور پھر اُس آدمی کی پیشانی، اُس کے پہلو اور اُس کی پشت کو داغا جائے گا اور اُس سے یہ کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، آج تم اس خزانے کا مزہ چکھو جو تم اپنے لیے جمع کررہے تھے۔

۴:- شرم گاہوں کی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے جنسی خواہش کی تکمیل کا ایک جائز طریقہ یعنی نکاح مشروع کیا ہے۔ انسان کی

کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک شرط یہ بھی رکھی ہے کہ ہم جائز طریقہ کے علاوہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میاں بیوی کا ایک دوسرے سے شہوتِ نفس کو تسکین دینا قابلِ ملامت نہیں، بلکہ انسان کی ضرورت ہے، لیکن جائز طریقہ کے علاوہ کوئی بھی صورت شہوت پوری کرنے کی جائز نہیں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جائز طریقہ کے علاوہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو ایسے لوگ حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زنا کے قریب بھی جانے کو منع فرمایا ہے۔ (سورۃ الاسراء:۳۲)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: آنکھ بھی زنا کرتی ہے اور اس کا زنا نظر ہے۔ آج روزمرہ کی زندگی میں مرد وعورت کا کثرت سے اختلاط، مخلوط تعلیم، بے پردگی، TV اور انٹرنیٹ پر فحاشی اور عریانی کی وجہ سے ہماری ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ ہم خود بھی زنا اور زنا کے لوازمات سے بچیں اور اپنے بچوں، بچیوں اور گھر والوں کی ہر وقت نگرانی رکھیں، کیونکہ اسلام نے انسان کو زنا کے اسباب سے بھی دور رہنے کی تعلیم دی ہے۔ زنا کے وقوع ہونے کے بعد اس پر ہنگامہ، جلسہ وجلوس ومظاہروں کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق حتی الامکان غیرمحرم مرد وعورت کے اختلاط سے ہی بچا جائے۔

۵:-امانت کی ادائیگی

امانت کا لفظ ہر اس چیز کو شامل ہے جس کی ذمہ داری کسی شخص نے اُٹھائی ہو اور اس پر اعتماد وبھروسہ کیا گیا ہو، خواہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہو یا حقوق اللہ سے۔ حقوق اللہ سے متعلق امانت فرائض وواجبات کی ادائیگی اور محرمات ومکروہات سے پرہیز کرنا ہے اور حقوق العباد سے متعلق امانت میں مالی امانت کا داخل ہونا تو مشہور ومعروف ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کوئی راز کی بات کسی کو بتلائی تو وہ بھی اس کی امانت ہے، اذنِ شرعی کے بغیر کسی کا راز ظاہر کرنا امانت میں خیانت ہے۔ اسی طرح کام کی چوری یا وقت کی چوری بھی امانت میں خیانت ہے، لہٰذا ہمیں امانت میں خیانت سے بچنا چاہیے۔

۶:-عہد و پیمان پورا کرنا

عہد ایک تو وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی معاملہ میں لازم قرار دیا جائے، اس کا پورا کرنا ضروری ہے، دوسرا وہ جس کو وعدہ کہتے ہیں، یعنی کوئی شخص کسی شخص سے کوئی چیز دینے کا یا کسی کام کے کرنے کا وعدہ کرلے، اس کا پورا کرنا بھی شرعاً ضروری ہو جاتا ہے۔ غرضیکہ اگر ہم کسی شخص سے کوئی عہد و پیمان کرلیں تو اس کو پورا کریں۔

۷:-نماز کی پابندی

کامیاب ہونے والے وہ ہیں جو اپنی نمازوں کی بھی پوری نگرانی رکھتے ہیں، یعنی پانچوں نمازوں کو ان کے اوقات پر اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ نماز میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت وتاثیر رکھی ہے کہ وہ نمازی کو گناہوں اور برائیوں سے روک دیتی ہے، مگر ضروری ہے کہ اس پر پابندی سے عمل کیا جائے اور نماز کو اُن شرائط وآداب کے ساتھ پڑھا جائے جو نماز کی قبولیت کے لیے ضروری ہیں، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: ''نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔'' (سورۃ العنکبوت: ۴۵) اسی طرح حدیث میں ہے کہ: ''ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا کہ فلاں شخص راتوں کو نماز پڑھتا ہے، مگر دن میں چوری کرتا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''اس کی نماز عنقریب اس کو اس برے کام سے روک دے گی۔'' (مسند احمد، صحیح ابن حبان، بزار)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی کامیابی کے لیے ضروری سات اوصاف کو نماز سے شروع کیا اور نماز پر ہی ختم کیا، اس میں اشارہ ہے کہ نماز کی پابندی اور صحیح طریقہ سے اس کی ادائیگی انسان کے پورے دین پر چلنے کا اہم ذریعہ بنتی ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں سب سے زیادہ نماز کی ہی تاکید فرمائی گئی ہے۔ کل قیامت کے دن سب سے پہلے نماز ہی کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ نماز کے علاوہ تمام احکام اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطہ دنیا میں اُتارے، مگر نماز ایسا مہتم بالشان عمل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے واسطہ کے بغیر نماز کی فرضیت کا تحفہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نمازوں کا اہتمام کرنے والا بنائے آمین، ثم آمین۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی طبیعت میں کامیابی کی چاہت رکھی ہے، چنانچہ ہر انسان کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ انسان کی کامیابی' ایمان کے بعد سات صفات میں مضمر ہے، یعنی اگر ہم کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے اندر یہ صفات پیدا کریں۔ ان سات اوصاف سے متصف ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ نے ۱۰ اور ۱۱ آیات میں جنت الفردوس کا وارث بتلایا ہے۔ لفظ ''وارث'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح مورث کا مال اس کے وارث کو پہنچنا قطعی اور یقینی ہے، اسی طرح ان سات اوصاف والوں کا جنت الفردوس میں داخلہ یقینی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سات اوصاف کے ساتھ زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں جنت الفردوس کا وارث بنائے، آمین۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ ....

مدرسہ کا آغاز وارتقاء...جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کا تعلیمی منہج اور کردار.....ایک تحقیقی مطالعہ

(پہلی قسط)

ڈاکٹر مولانا انعام اللہ
چیف ریسرچ آفیسر اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

مقدمہ

برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر علماء حق کا بہت بڑا احسان ہے، جنہوں نے دینی مدارس اور جامعات قائم کیے، جس کی بدولت جہاں دینی علوم کی حفاظت واشاعت کا اہتمام ہوا، وہاں ایسے علماء حق پیدا ہوئے جنہوں نے اُمت کی دینی، ایمانی اور اخلاقی تربیت فرمائی، نیز میدانِ عمل میں انسانیت کی فلاح کے لیے عملی نمونے پیش کیے۔ انہی مدارس کی بدولت آج شعائرِ اسلام زندہ ہیں، منکر ومعروف کا فرق واضح ہے۔ علماء حق کی ان برگزیدہ ہستیوں میں محدث کبیر علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، جنہوں نے اکابرِ اُمت کے تلمذ، صحبت ورفاقت کی بدولت اپنے آپ کو کندن بنایا، اور پوری زندگی علومِ نبوت کی تعلیم وتعلم اور تدریس واشاعت میں گزاری۔ طویل تجربہ کی بنیاد پر منفرد نمایاں خصوصیات کے حامل ایک ایسے تعلیمی وتربیتی ادارے کی بنیاد رکھی جس سے علماء ربانیین کی صفات کی حامل شخصیات اور رجال کار پیدا ہوئے، جنہوں نے علم وعمل کے میدان میں پوری دنیا کے اندر وہ کارنامے سرانجام دیے، جو مسلمانانِ عالم کے لیے مینارۂ نور کی حیثیت اختیار کر گئے، اور ایسے نقوش ثبت کیے، جو رہتی دنیا تک عقیدہ اور عمل کے میدان میں اسلامی شناخت کے حامل معاشرے کے قیام وبقاء کے ضامن وکفیل ہیں۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی اس جہدِ مسلسل کو ایسی قبولیت ملی کہ ان کی زندگی ہی میں جامعہ کی حیثیت ایک بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کی سی ہوگئی، جہاں سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے ہزاروں تشنگانِ علومِ دینیہ فیض یاب ہوکر اپنے اپنے علاقوں، شہروں اور ملکوں میں جاکر کام کرنے لگے، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں نے اس گلشن کو مزید ترقی دی، اور جامعہ کے دینی وفلاحی اثرات کو مزید وسعت دی۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقد

ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس بعنوان: ''پاکستان میں اسلامی تعلیمات، مسائل اور امکانات'' میں پیش کیے جانے والے اپنے مقالے کے لیے میں نے عظیم دینی پس منظر، منفرد کارکردگی اور روشن تاریخ کے حامل اس عظیم ادارے کو موضوعِ بحث بنایا ہے، تاکہ بین الاقوامی سطح پر میڈیا کے ذریعے دینی مدارس کے حوالے سے منفی پروپیگنڈے کے زور پر بنائے گئے تاریک ماحول میں اس مینارۂ نور کے روشن پہلو چمکیں، اور سرکاری جامعات کی دنیا میں اس ادارے کا صحیح اور درست تعارف ہوجائے، اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہوجائے۔ مقالہ ایک مقدمہ، تمہید، تین فصلوں اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقدمہ میں خطۃ البحث (خاکہ) پیش کیا گیا، جو حسب ذیل ہے:

تمہید:...''دینی مدارس کا تاریخی پسِ منظر''

پہلی بحث:...''بانی جامعہ علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، شخصیت اور خدمات''

دوسری بحث:...''جامعۃ العلوم الاسلامیہ، تعارف، تعلیمی وتربیتی نظام''

تیسری بحث:...''جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی کارکردگی، خدمات اور اسلامی معاشرے پر اثرات''

خاتمہ:...''نتائجِ بحث اور تجاویز''

تفصیل ملاحظہ ہو:

تمہید: دینی مدارس کا تاریخی پسِ منظر

دینی مدارس ومکاتب کے تاریخی پسِ منظر کو بیان کرنے سے پہلے اس بات کی وضاحت مناسب ہے کہ ہر چیز کی طرح دینی مدارس کو دو زاویوں سے دیکھنے کی ضرورت ہے: ایک ظاہری اعتبار سے اور دوسرا مقاصد اور روح کے اعتبار سے۔ مقاصد وروح کے اعتبار سے مدرسے کی حقیقت یہ ہے کہ وحی کے ذریعے ملنے والے علوم کو سینہ بسینہ آنے والی نسل کو منتقل کیا جائے۔ اس لحاظ سے اس مقدس مشن کا آغاز اس وقت سے ہوا، جب پہلی مرتبہ غارِ حرا میں ''اِقْـــرَأْ'' کے الفاظ کے ساتھ وحی کا نزول ہوا۔ وحی کی تعلیمات ہمہ گیر تھیں، جس میں انسانی زندگی گزارنے کے لیے جہاں راہنما اُصول بیان کیے گئے، وہاں ان اُصولوں کی تعلیم وتعلم کے طور طریقے بھی بیان ہوئے ہیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تعلیمات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو منتقل کیں، اوران ارواحِ قدسیہ نے اپنے شاگردوں (تابعین) کو سکھائیں، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے، اور تاقیامت جاری رہے گا۔ مقصد کے اعتبار سے مدرسہ، استاذ، شاگرد اور نصاب (علوم وحی) سے تعبیر ہے، تاہم ظاہری اعتبار سے مدرسے کے وجود کے لیے چند اضافی امور کی ضرورت ہے۔ گویا تمام ایسے مراکز کو دینی مدرسہ کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے، جن میں پڑھنے

پڑھانے کا خصوصی اہتمام ہو، بالفاظِ دیگر مدرسہ وہ جگہ ہے جس پر باقاعدہ ادارے کا اطلاق ہوسکے۔
اس تناظر میں مدارس کے تاریخی پسِ منظر کو چار ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: پہلا: قرونِ اولیٰ کا دور، دوسرا: قرونِ وسطیٰ کا دور، تیسرا: ایسٹ انڈیا کمپنی کی برصغیر میں آمد سے پہلے کا دور، اور چوتھا: ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد اور تسلُّط کے بعد کا دور۔

پہلا دور: قرونِ اُولیٰ

قرونِ اُولیٰ سے مراد عہدِ رسالت، عہدِ خلافتِ راشدہ اور قرونِ ثلاثہ مشہود لہا بالخیر ہیں۔ احادیث وسیرت میں ابتدائی مکاتب ومدارس کا تصور ملتا ہے، تاہم یہ لغوی معنی کے اعتبار سے مدارس تھے، یعنی پڑھنے پڑھانے کی جگہ، عرفی معنی کے اعتبار سے مدارس کا سلسلہ چوتھی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا۔ (۱) جن میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:

۱:- مدرسہ صحنِ ابی بکر رضی اللہ عنہ

آپ کے گھر کے سامنے ایک چبوترہ تھا، جس پر آپ نماز ادا کرتے اور قرآن پڑھا کرتے تھے۔ مشرکین کے بچے اور عورتیں آپ کے گرد جمع ہوجاتے اور قرآن کو سنتے تھے۔ کفارِ مکہ کو یہ ناگوار گزرا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ (۲)

۲:- مدرسہ دارِ ارقمؓ

ابتدائے اسلام میں کوہِ صفا کے دامن میں واقع بن ارقمؓ کے مکان میں یہ مدرسہ قائم تھا، جس میں چالیس صحابہ کرامؓ (مرد وعورتیں) تعلیم وتعلم میں مشغول رہتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود معلم تھے، حضرت ابوبکر، حضرت حمزہ وحضرت علی رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ اس کے طالب علم تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی جگہ اسلام قبول کیا۔ یہاں قیام وطعام کا انتظام بھی تھا، یہ جگہ دار الاسلام کے نام سے مشہور ہوگئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ: مسلمان ہونے والوں کو ایک ایک دو دو کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صاحبِ حیثیت کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ لوگ وہاں رہ کر کھانا کھاتے تھے۔ میرے بہنوئی کے گھر بھی دو آدمی موجود تھے، ایک خبابؓ بن ارت تھے، جو میرے بہنوئی اور بہن کے پاس جا جا کر قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ (۳)

۳:- مدرسہ اُختِ عمرؓ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور بہن (سعید بن زید اور اُم جمیل فاطمہ رضی اللہ عنہا) کے گھر مکتب قائم تھا، جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی تلاوت سنی اور مخالفت اور مارکٹائی تک نوبت پہنچنے کے بعد

یہی واقعہ ان کے ایمان لانے کا باعث بنا۔ (۴)

۴:- مدرسہ مدینہ یا مدرسہ مصعب بن عمیرؓ

ہجرتِ مدینہ سے پہلے آپ نے حضرت مصعب بن عمیر اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہما کو مدینہ روانہ فرمایا، جہاں وہ مدینہ والوں کو قرآن پڑھاتے تھے۔ (۵)

۵:- مدرسہ صفہ

تاہم مدینہ منورہ میں مدرسہ صفہ کا قیام عہدِ رسالت میں مدرسہ کے وجود کی نمایاں مثال ہے۔ مدرسہ صفہ میں پڑھنے والے صحابہ کرامؓ- جو اہل الصفہ کہلاتے تھے- کی کل تعداد ۴۰۰ تک پہنچتی ہے، بیک وقت صفہ کے طلبہ کی تعداد ستر، اُسی تک ہوتی تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اس مدرسہ کے طالب علم تھے۔ (۶)

عہدِ خلافتِ راشدہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں مکاتب و مدارس کو وسعت دی اور باقاعدہ نظام کے تحت ان کو آگے بڑھایا۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو جامع مسجد دمشق میں قرآن پڑھانے کے لیے مقرر کیا، جہاں ایک موقع پر ۱۶۰۰ (سولہ سو) طالب علم ان کے درس میں شریک رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درسِ حدیث کے حلقے بھی قائم فرمائے۔

یہ سلسلہ قائم رہا اور آنے والے خلفاء اور امراء نے اس کو مزید وسعت دی، ہر بستی میں مدارس و مکاتب قائم تھے۔ امیر لوگ ان مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کے قیام وطعام، اور لباس سمیت تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔

دوسرا دور: قرونِ وسطیٰ

مدارس و مکاتب کی تاریخ میں دو اداروں کو اس حوالے سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ اب تک تعلیمی ادارے کی حیثیت سے قائم ہیں: ایک جامعۃ الزیتون، جو تیسری صدی ہجری میں تیونس کی جامع مسجد میں قائم ہوا تھا۔ دوسرا جامع ازہر، جو فاطمی سلاطین کے دور میں مصر میں قائم ہوا، ۳۶۱ھ میں اس کی تکمیل ہوئی، اور چوتھی صدی ہجری کے اواخر سے اس کی تعلیمی زندگی کا آغاز ہوا، اور آج تک قائم ہے۔ تاہم علامہ مقریزیؒ کے مطابق باقاعدہ ادارے کی شکل میں مدرسے کی بنیاد رکھنے والے اہلِ نیشاپور ہیں، جنہوں نے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد ڈالی۔ علامہ مقریزی نے مصر میں قائم ۷۰ سے زائد مدارس کا تعارف کرایا۔ (۷) چند دیگر مدارس بھی ہیں جن میں سلطان محمود غزنوی اور ان کے بیٹے سلطان مسعود

کے قائم کردہ مدارس، اور مدرسہ نظامیہ، بغداد؛ دولتِ سلجوقیہ کے علم دوست وزیر نظام الدین طوسی (۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ شامل ہیں۔ امام غزالیؒ اس نظامیہ سے فیض حاصل کرنے والوں میں سے ہیں اور ان کے استاذ امام الحرمین اس مدرسہ کے صدر مدرس تھے۔ علاوہ ازیں بغداد میں تیس بڑے مدارس تھے۔

تیسرا دور: ہندوستان میں مدارسِ دینیہ کا قیام

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا مستقل قیام ۶۰۲ھ/ ۶۰۶ھ سے شروع ہوا، ایک صدی گزرنے پر ہندوستان علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔ صرف دہلی شہر میں ایک ہزار اسلامی مدارس تھے۔ (۸) عالمگیر اورنگزیب کے عہد میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں چار سو مدرسے تھے۔ دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، جونپور، لکھنؤ، خیرآباد، پٹنہ، اجمیر، سورت، دکن، مدارس، بنگال اور گجرات وغیرہ بہت سے مقامات علم وفن کے مرکز تھے۔ صرف بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک مفت تھی، علماء وطلبہ کسبِ معاش سے مطمئن ہوکر فراغت وسکونِ خاطر کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔

چوتھا دور: ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد کے بعد مدارس کا نظام

ایسٹ انڈیا کمپنی کی برصغیر میں آمد کے بعد ہندوستان کا جہاں عمومی سیاسی وانتظامی نقشہ تبدیل ہونے لگا، اور کمپنی آہستہ آہستہ ملک پر قابض ہونے لگی، تا آنکہ کمپنی نے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کیا، وہاں تعلیمی نظام بھی یکسر تبدیل کر دیا گیا، مدارس کے تمام اوقاف کو ۱۸۳۸ء میں ضبط کرلیا گیا اور اصحابِ خیر کی طرف سے مقرر کردہ وظائف وتنخواہیں تو حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی موقوف ہو چکے تھے، جس کے نتیجے میں سینکڑوں خاندان تباہ ہوگئے۔ تعلیمی ادارے یک قلم مٹ گئے، لیکن ان حوادثاتِ زمانہ کے باوجود چند اصحابِ عزیمت علماء موجود تھے، جنہوں نے مالی امداد ومعاونت کے بغیر اشاعتِ علومِ دینیہ کا سلسلہ جاری رکھا۔

دوسری طرف ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مشن سکول کھولنے کا موقع دیا گیا۔ ان سکولوں کو کمپنی کی پشت پناہی حاصل رہی، سہولتیں اور مالی امداد فراہم کی جانے لگیں، اور یہاں کے فضلاء کو ملازمتوں کی لالچ دی گئی۔

یہ نظامِ تعلیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قومی روایات اور علوم وفنون کے لیے تباہ کن اور مہلک حربہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے دلوں کو ہیبت زدہ، دماغوں کو ماؤف، روحوں کو پژمردہ اور پوری قوم کو مفلوج کر دیا۔ تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بے گانگی میں روزافزوں اضافہ ہوتا رہا۔ ایسے

حالات میں اربابِ علم وفضل نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مذہبی وجود کو بچانے کے لیے دینی تعلیم کے سوا کوئی چیز فائدہ منداور کارگرنہیں، اس مقصد کے لیے قدیم تعلیمی نظام کی نشأۃِ ثانیہ کوضروری سمجھا گیا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ساتھیوں سمیت توکلاً علی اللہ ۱۸۶۷ء میں دیوبند، ضلع سہانپور کی تاریخی مسجد چھتہ میں دارالعلوم کی بنیادرکھ دی، جو بہت جلد دنیائے اسلام کی بہت بڑی درس گاہ بن گئی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، شیخ المحد ثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ جیسے آفتابِ علم وفضل دیو بند نے پیدا کیے تھے۔ (۹) شیخ الہندؒ کے شاگردوں میں آفتابِ علم وفضل کا ایک نمایاں نام مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اورعلامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ ہستیوں میں سب سے نمایاں نام علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دارالعلوم دیو بند سے فیض یافتہ ان علمی ہستیوں نے دارالعلوم دیو بند کے ساتھ ساتھ دیگر شہروں اور بستیوں میں مکاتب ومدارس قائم کیے، پاکستان کے بعد یہاں بھی مدارس کی تأسیس کا سلسلہ شروع ہوا، اور کئی ایک عظیم مدارس وجامعات منصۂ شہود پرآئے، جن میں ایک نمایاں نام جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی ہے، جس کے بانی علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

پہلی بحث:...علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ، شخصیت، خدمات

نام ونسب

سید محمد یوسف بن محمد زکریا بن میر مزمل شاہ ابن میر احمد شاہ بن میر موسیٰ بن غلام حبیب بن رحمۃ اللہ بن عبدالاحد بن حضرۃ محمد اولیاء بن سید آدم البنوری بن اسماعیل بن بھوا بن حاجی یوسف بن یعقوب بن حسین بن دولت بن قلیل بن سعدی بن قلندر ابن حضرت محمد العلوی بن علی بن اسماعیل بن ابراہیم بن موسیٰ کاظم بن جعفر الصادق بن محمد الباقر بن زین العابدین علی، بن سیدنا حسین، بن امیر المؤمنین علی بن أبی طالب کرم اللہ وجہہٗ۔ (۱۰)

جائے پیدائش اور وطن

۶/ربیع الثانی ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء ضلع مردان، پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبے مہابت آباد میں آنکھ کھولی، (۱۱) آپ کے جدِ اعلیٰ سید آدم ضلع انبالہ، ہندوستان، کے قصبہ بنور میں قیام پذیر رہے تھے، اسی نسبت سے خاندانِ بنوریؒ کہلاتا ہے، جو افغانستان، کوہاٹ اور پشاور میں آباد ہے۔ (۱۲)

عملی زندگی کا آغاز

قرآن مجید اور دیگر ابتدائی علوم اپنے والد سید محمد زکریاؒ، ماموں شیخ فضل حمدانی بنوریؒ سے پڑھے اور والیِ افغانستان امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ میں کابل، افغانستان، میں شیخ عبداللہ بن خیر

اللہ پشاوریؒ (متوفی: ۱۳۴۰ھ) سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ مختلف فنون کی متوسط درجے کی کتابیں پشاور اور کابل میں شیخ عبدالقدیر لقانیؒ اور شیخ محمد صالح قیلغویؒ سے پڑھیں۔ ابتداء ہی سے ادبِ عربی میں خاص ذوق رکھتے تھے، اعلیٰ علوم کی تحصیل کے لیے دارالعلوم دیوبند کے لیے رختِ سفر باندھا، جہاں اپنے وقت کے رجالِ علم سے تفسیر، حدیث، فقہ اور اُصولِ فقہ میں اکتسابِ علم کیا، بالخصوص علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ سے خصوصی مناسبت قائم ہوئی۔ ۱۳۴۵ھ تا ۱۳۴۷ھ دو سال تک دیوبند میں قیام رہا اور جب علامہ عثمانی اور علامہ کشمیری رحمہما اللہ دیوبند سے جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل سورت منتقل ہوئے تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے رفقاء سمیت اپنے شیوخ کے ساتھ ڈابھیل منتقل ہوئے، اور وہیں پر علمِ حدیث کی تکمیل کی، اور حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کے امین بنے۔ فراغت کے بعد چار سال تک پشاور میں رہے۔ پہلے جمعیت العلماء کے صدر کی حیثیت سے سیاسی خدمات انجام دیتے رہے، اور بعد میں سیاست سے اپنے آپ کو فارغ کر کے مدرسہ رفیع الاسلام میں تدریس شروع کی۔ حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس کی حیثیت سے تقرر کیا گیا، جہاں شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے منصب تک پہنچے اور ۱۹۵۱ء میں پاکستان منتقل ہونے تک جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ (۱۳)

پاکستان کی طرف ہجرت

۱۶؍جنوری ۱۹۵۱ء میں اپنے استاذ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا بدر عالم میرٹھیؒ کے مشورہ سے پاکستان منتقل ہوئے، بعض وزراء نے استقبال کیا، اور علامہ عثمانیؒ کے مشورہ پر دارالعلوم ٹنڈوالہ یار سندھ، میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے تین سال تک خدمات سرانجام دیں۔ (۱۴)

جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کا قیام

حکمتِ خداوندی کو کچھ اور منظور تھا، آپ کی ذات والا صفات سے کراچی جیسے عروس البلاد شہر میں دینی علوم کی اشاعت وتبلیغ کا عظیم الشان کام لینا تھا، جہاں آپ نے نیوٹاؤن میں مدرسہ عربیہ کے نام سے مدرسہ کی بنیاد رکھی، بعد میں جس کا نام جامعہ علومِ اسلامیہ رکھا گیا، جس کی تفصیل اس مقالہ کا موضوع ہے۔ (۱۵)

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا علمی مقام

کسی بھی علمی شخصیت کے علمی مقام کا اندازہ ان کی تعلیمی، تدریسی اور تصنیفی خدمات، معاصرین کے اعتماد، اساتذہ وشیوخ اور تلامذہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت بنوریؒ کی علمی استعداد،

قوتِ حافظہ، تمام علوم وفنون پر قدرت اور تدریس، تصنیف اور وعظ وارشاد میں مہارتِ تامہ ضرب المثل تھی، دنیا جس کی شاہد اور معترف ہے اور جس کا بین ثبوت آپ کی علمی خدمات اور علماء کا اعتماد ہے۔ ڈابھیل کے عرصۂ تدریس ہی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ اور قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی طرف سے دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم علمی مرکز میں منصبِ افتاء اور مسندِ تدریس پر فائز ہونے کی پیشکش کی گئی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جامعہ احمدیہ بھوپال میں شیخ الحدیث کا منصب سنبھالنے کی پیشکش کی، تاہم آپ نے ڈابھیل میں تدریسی خدمات سرانجام دینے کو ترجیح دی۔ ٹنڈو الہ یار سندھ میں عرصۂ تدریس کے دوران بھی مختلف مدارس کی طرف سے شیخ الحدیث کی حیثیت سے تعیناتی کی پیشکش آتی رہی، تاہم دینی علوم کی بہتر تدریس کے حوالے سے آپ کی اپنی ایک سوچ تھی۔ نصاب میں کیا مثبت تبدیلیاں ہوں؟! طریقۂ تدریس کیا ہو؟! نیز مختلف فنون میں متخصصین کی جماعت تیار کی جائے۔ اس لیے آپ اپنے ادارے کے قیام کے حوالے سے مسلسل سوچ وبچار اور استخارہ کرتے رہے، تاکہ آزادانہ طریقے پر کام کرسکیں، تاآنکہ ادارے کا قیام وجود میں آیا۔ (۱۶)

اساتذہ ومشائخ

ابتدائی کتب جن اساتذہ کرام سے پڑھیں ان کا تذکرہ شروع میں گزرگیا۔ علومِ عالیہ بالخصوص احادیث میں آپ نے جن جہابذۂ علم سے استفادہ کیا، ان کے اسماء گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱:- علامہ حافظ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ
۲:- شیخ عبدالرحمٰن امروہی رحمۃ اللہ علیہ
۳:- مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
۴:- علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ
۵:- مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ
۶:- شیخ حسین بن محمد طرابلسی رحمۃ اللہ علیہ
۷:- علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ (وکیل شیخ الاسلام، استنبول، ترکی)
۸:- شیخ عمر بن احمدان المقدسی المالکی المغربی رحمۃ اللہ علیہ
۹:- شیخ محمد بن حبیب اللہ مایأبی الجکنی الشنقیطی رحمۃ اللہ علیہ
۱۰:- شیخ خلیل خالدی المقدسی رحمۃ اللہ علیہ
۱۱:- شیخہ امۃ اللہ بنت الشیخ عبدالغنی رحمہا اللہ۔ (۱۷)

تلامذہ

آپ کے تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے، پشاور، ڈابھیل اور ٹنڈو الہ یار میں تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد آخر میں اپنے قائم کردہ مدرسہ عربیہ اسلامیہ میں مسلسل ۲۴ سال تدریس

کا فریضہ سرانجام دیا، اس طویل عرصے میں ہزاروں علماء ومفتیان کرام نے آپ سے استفادہ کیا۔ آپ کے تمام تلامذہ کا استقصاء اس مختصر مقالہ میں ناممکن ہے، تاہم ان چند نمایاں شاگردوں - جنہوں نے آپ کے قائم کردہ جامعہ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں- میں مولانا بدیع الزمانؒ، ڈاکٹر مولانا محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ، مولانا سید مصباح اللہ شاہؒ، مفتی احمد الرحمٰنؒ، مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ، مولانا عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ، مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر، مولانا محمد انور بدخشانی، مولانا قاری مفتاح اللہ مدظلہم العالی شامل ہیں۔

آپ کے شاگردوں میں بعض عرب علماء بھی ہیں، جنہوں نے آپ سے اجازتِ حدیث حاصل کی۔ (۱۸)

تدریسی خدمات

آپ نے زندگی بھر درس وتدریس کا مشغلہ اپنائے رکھا، تمام علوم وفنون کی تدریس کی، بالخصوص تفسیرِ قرآن کی تدریس میں آپ کو ملکہ راسخہ حاصل تھا۔ اپنے اساتذہ کے حکم پر دارالعلوم ٹنڈو الہ یار میں شیخ التفسیر کی حیثیت سے تعیناتی آپ کی مہارتِ تامہ فی التفسیر کی کافی شہادت ہے، لیکن جس علم کی تدریس نے آپ کی علمی زندگی کو چار چاند لگائے، وہ کتبِ حدیث، بالخصوص صحاحِ ستہ کی تدریس ہے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں آپ نے مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ اور مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ کی موجودگی میں طلبہ کے انتخاب پر صحیح بخاری، سننِ ترمذی اور سننِ ابی داؤد جیسی اہم کتابیں پڑھائیں اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد اپنے قائم کردہ مدرسہ میں تاحیات کتبِ حدیث پڑھاتے رہے۔ صحیح معنوں میں اپنے زمانے کے محدث اور شیخ الحدیث تھے۔ ایسے تفسیری وحدیثی نکات بیان فرماتے کہ علماء وطلبہ انگشت بدنداں رہ جاتے۔ مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے علمی نکات کو بعنوان: ''خوانِ بنوریؒ سے خوشہ چینی'' جمع کیا ہے، جو مقالاتِ امین میں اسی عنوان سے چھپا ہے۔ (۱۹) اور ماہنامہ بینات کراچی میں بھی قسط وار چار اقساط میں بعنوان ''خوانِ بنوریؒ سے مولانا اورکزئیؒ کی خوشہ چینی'' چھپ گیا ہے۔ (۲۰)

تنظیمی مناصب

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ تدریس وتالیف کے ساتھ علمی مجالس اور دینی تحریکات میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے، جس کا اندازہ ان مناصب سے ہوتا ہے، جن پر آپ مختلف حیثیتوں سے فائز رہے، ذیل میں ان کی فہرست ملاحظہ ہو:

۱:- صدر جمعیت علماء، پشاور

۲:- صدر جمعیت علماء ہند، گجرات، ہند

۳:- رکن اوقاف کمیٹی، بمبئی، ہند ۴:- رکنِ مجلسِ علمی، ڈابھیل، سورت

۵:- صدر مدرس وشیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ، ڈابھیل ۶:- شیخ التفسیر دار العلوم الاسلامیہ، ٹنڈو الہ یار

۷:- بانی ومہتمم وشیخ الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

۸:- رکن مجمع علمی عربی، دمشق، سوریا ۹:- رکن مجمع البحوث الاسلامیہ، قاہرہ، مصر

۱۰:- رکن سلیکشن بورڈ، کراچی یونیورسٹی ۱۱:- صدر مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت، پاکستان

۱۲:- صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان ۱۳:- صدر مجلسِ عمل، پاکستان

۱۴:- بانی وصدر مجلسِ دعوت وتحقیق اسلامی، کراچی

۱۵:- نگران مجلسِ علمی، کراچی، جوہانسبرگ، ساؤتھ افریقہ، ہندوستان

۱۶:- صدر جمعیت اتحاد المدارس العربیہ ۱۷:- رکن اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد (۲۱)

علمی وتبلیغی اسفار

سال میں دو مرتبہ حرمین شریفین کے مبارک سفر کی سعادت حاصل کرنا آپ کا معمول تھا۔ قاہرہ مصر کے تین اسفار کیے۔ پہلے ۱۹۳۷ء میں بعض کتب کی طباعت کی نگرانی کی غرض سے تشریف لے گئے، بعد ازاں ! کانفرنسز میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ کانفرنس بعنوان: ’’رسالۃ المسجد، مکۃ المکرّمہ، رمضان ۱۳۹۵ھ ستمبر ۱۹۷۵ء‘‘ میں شرکت فرمائی، اس کانفرنس میں ’’المسجد محور للنشاط ومركز للتوجيه الروحي والفكري للأمة‘‘ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ ’’مؤتمر الدعوة الإسلامية، ۱۳۹۰ھ/ ۱۹۷۰ء طرابلس، لیبیا‘‘ میں پاکستانی وفد کے رئیس کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔ اکثر ممالک میں علمی وتبلیغی اسفار کیے، جیسے: ترکی، لبنان، اردن، فلسطین، عراق، لیبیا، سوریا، ایران، افغانستان، تنزانیہ، نائجیریا، کینیا، یوگنڈا، موزمبیق، یونان، فرانس، برطانیہ، جنوبی افریقہ، سوئٹزرلینڈ، اسپین، ہندوستان۔ (۲۲)

تصنیفی خدمات

تصنیف وتالیف اور انشاء میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ آپ بیک وقت عربی، فارسی، اردو، پشتو کے ماہر ادیب تھے۔ بڑی روانی اور سلاست کے ساتھ مافی الضمیر کو صفحۂ قرطاس پر اُتارتے۔ ادبِ عربی میں تو آپ کی تحریریں عرب ادیبوں کی تحریروں سے کسی طرح کم درجے کی نہیں ہوتی تھیں۔ اس وصف میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، اس لیے آپ کی اکثر کتابیں عربی زبان میں ہیں، جو علوم وفنون کے ساتھ ساتھ ادبِ عربی کی شاہکار ہیں۔ تصانیف حسبِ ذیل ہیں:

۱:-بغية الأريب في مسائل القبلة والمحاريب

۲:-نفحة العنبر في حياة الشيخ أنورؒ، طبع، دہلی ۱۳۵۳ھ

۳:- يتيمة البيان في شئيي من علوم القرآن، طبع: دہلی ۱۹۳۶ء

۴:-معارف السنن شرح جامع الترمذي، طبع: مجلس الدعوة والتحقيق الاسلامي، کراچی، صحاحِ ستہ کی مشہور کتاب ''جامع ترمذی'' کی شرح ہے، جو چھ جلدوں پر مشتمل عربی زبان کی شاہکار ہے۔

۵:-عوارف المنن، مقدمة معارف السنن

۶:-الأستاذ المودودي وشيء من حياته وأفكاره

۷:-نص الختام في مسألة الفاتحة خلف الإمام، طبع: کراچی ۱۹۶۶ء

۸:-کتاب الوتر، مطبوعہ ۱۹۶۳ء، کراچی۔ ۹:-المقدمات البنورية

۱۰:-القصائد البنورية ۱۱:- بصائر وعبر۔ (۲۳)

وفات حسرت آیات

بروز پیر، ۳ رذوالقعدۃ، ۱۳۹۷ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۹۷۷ء، علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوا، آپ اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد کے رکن کی حیثیت سے اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد تشریف لائے تھے، جہاں دل کا دورہ پڑا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ جسدِ خاکی کراچی منتقل کردیا گیا، اور ایک جم غفیر نے جنازہ میں شرکت کی۔ کراچی کو کسی عالم کے اتنے بڑے اجتماع کا شرف حاصل ہوا۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی حدود میں تدفین عمل میں آئی، جہاں قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے تلامذہ اور متعلقین کی آمد رہتی ہے۔ (۲۴)

دوسری بحث: جامعۃ العلوم الاسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، تعارف، تعلیمی وتربیتی نظام

علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی تمام دینی وعلمی خدمات کی عملی صورت اور عنوان آپ کا قائم کردہ مدرسہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ ہے۔ اس مدرسہ کا تصور، قیام اور تعمیر وترقی کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ یہ الہامی ہے، تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ زندگی بھر تدریس کے شعبے سے منسلک رہے، اپنے تدریسی تجربے کی روشنی میں تعلیم وتربیت کے حوالے سے آپ کی ایک سوچ بن گئی تھی، جس کو عملی شکل دینے کے لیے ایسے ماحول کی ضرورت تھی، جس میں آپ آزادانہ طریقے سے وہ تبدیلیاں لاسکیں، جو آپ چاہتے تھے۔ اسی سوچ کے نتیجے میں آپ نے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھنے کا ارادہ کیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا، فرماتے ہیں:

اس عظیم الشان منصوبے کے لیے اخلاص، ہمت، عزم، جہدِ مسلسل، اور صبر واستقامت کے ساتھ ساتھ کامل استعداد والے رفقاء کی ٹیم کی ضرورت تھی، مالی امداد کے بغیر بھی کوئی منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام حوالوں سے میں تہی دست ہوں، اس لیے حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ کیا، تاکہ ان مقدس مقامات میں استخارہ کرسکوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ سکوں۔

چنانچہ ۴/ ذوالحجہ ۱۳۷۳ھ کو حجِ بیت اللہ کے لیے رختِ سفر باندھا۔ بیس دن مکہ مکرمہ اور تیس دن مدینہ منورہ میں قیام فرمایا۔ اور دعاؤں واستخارہ کے بعد دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہ یار سندھ سے مستعفی ہوکر مستقل ادارے کی بنیاد رکھنے کا عزم کیا۔ جامع مسجد نیوٹاؤن- جس کی ابھی صرف بنیادیں رکھی گئیں تھیں- میں اللہ کا نام لے کر ادارے کی بنیاد رکھی۔ (۲۵)

مثالی مدرسہ، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: زندگی بھر کے تعلیمی، تدریسی اور انتظامی تجربے کے بعد مجھے خیال ہوتا تھا کہ اگر مستقبل میں مجھے ادارہ قائم کرنے کی توفیق ملی، تو اس میں حسبِ ذیل اُمور کا اہتمام کروں گا: ۱:- رائج الوقت نصاب اور نظام میں مناسب تبدیلیاں کرنا، جس سے پیدا ہونے والے علماء عصر حاضر میں اسلام کی صحیح خدمت کرسکیں۔ ۲:- اسباق اور تعلیم کی نگرانی کی طرح طلبہ کی دینی واخلاقی نگرانی کرنا۔ ۳:- طلبہ کے افکار کی اصلاح کرنا، تاکہ وہ دنیاوی جاہ ومنصب کے حصول کے بجائے خالص رضاء الٰہی اور خدمتِ اسلام کے لیے دینی تعلیم حاصل کریں۔ ۴:- عصرِ حاضر کے مطابق طلبہ میں لکھنے اور بولنے کی مہارت پیدا کرنا، بطورِ خاص عربی زبان میں لکھنے، بولنے اور عربی مصادر سے استفادہ کرنے کی صلاحیت اُجاگر کرنا۔ ۵:- علم التاریخ سے طلبہ کو متعارف کرانا اور کتبِ تاریخ کا مطالعہ کروانا۔ ۶:- منطق وفلسفہ کے بجائے علومِ نقلیہ پڑھنے کا زیادہ اہتمام کرنا۔ ۷:- درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد تخصصات کرانا، تاکہ علوم میں مہارت حاصل ہو۔ ۸:- علمی، عملی اور صلاح وتقویٰ کے اعتبار سے کامل مدرسین کا تقرر۔

مدرسہ عربیہ سے جامعۃ العلوم الاسلامیۃ تک

ان خطوط پر آپ نے کام کا آغاز کیا۔ ابتداءً مدرسہ کا نام ’’مدرسہ عربیہ‘‘ رکھا، بعد میں معلوم ہوا کہ اس نام سے ایک اور ادارہ بھی کراچی میں کام کر رہا ہے، اس لیے ’’اسلامیہ‘‘ کا لفظ بڑھا دیا گیا۔ اگرچہ ادارہ ابتداء ہی سے خصائص کے اعتبار سے بین الاقوامی یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن آپ نے تواضعاً یہ نام اختیار کیا، اور جب ادارے نے عالمی حیثیت اختیار کی اور بین الاقوامی جامعات اور اداروں سے تعامل شروع ہوا تو بیس سال بعد مجبوراً نیا نام ’’جامعۃ العلوم الاسلامیۃ‘‘ رکھا

گیا، جو اَب تک برقرار ہے۔ (۲۶)

نصابِ تعلیم کے بارے میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ دینی علوم کی تدریس اور مدارس کے قیام کو صرف درسِ نظامی کی تدریس کے تناظر میں نہیں دیکھتے تھے، بلکہ اسلامی معاشرے کی تشکیل، افرادِ معاشرے کی مکمل دینی تربیت کے تناظر میں دیکھتے تھے، اس لیے نصابِ تعلیم کے بارے میں آپ کا نظریہ جامعیت، تخصص اور تقسیم کے اصول پر مبنی تھا، اس لیے آپ نے حسب ذیل نقاط پر مشتمل نصاب تجویز کیا تھا:

۱:-مختصر کورسز

ناظرہ قرآن، تجوید اور ابتدائی دینی معلومات پر مشتمل مختصر نصاب، جو بچے مختصر مدت (سکولز کی سالانہ چھٹیوں) میں پڑھیں۔

۲:-مختصر سہ سالہ نصاب

ایک مختصر نصاب ان لوگوں کو سامنے رکھ کر وضع کیا جائے، جو دینی علوم کا شغف رکھتے ہوں، لیکن دنیاوی مصروفیات، کاروبار یا ملازمت کی وجہ سے مکمل درسِ نظامی نہ پڑھ سکتے ہوں، ایسے افراد کے لیے قرآن وحدیث اور فقہ کے منتخبات اور فنون میں سے ہر فن کی ایک ابتدائی کتاب پر مشتمل نصاب وضع کیا جائے جو تین سال کے عرصہ میں پڑھایا جاسکے۔

۳:-متوسط پانچ سالہ نصاب

پانچ سالہ نصاب بھی ان لوگوں کو مدِنظر رکھ کر وضع کیا جائے، جو کم فرصتی یا کسی وجہ سے مکمل درسِ نظامی نہ پڑھ سکیں۔ غیرملکی طلبہ کے لیے جامعہ میں اسی طرح کا نصاب مرتب کیا گیا تھا۔

۴:-مکمل درسِ نظامی

عالمِ دین بننے کے لیے رائج الوقت درسِ نظامی جو آٹھ یا نو سال کے عرصہ پر مشتمل ہو اور اس میں تخفیف، تیسیر اور اصلاح وترمیم کے اصول کارفرما ہوں۔ (۲۷)

۵:-تخصصات

درسِ نظامی سے فراغت حاصل کرنے والے علماء وفضلاء کے لیے مختلف علوم میں تخصص کے درجہ کی مہارت حاصل کرنے کے لیے دوسالہ نصاب۔ آپ نے تخصص فی الحدیث، تخصص فی الفقہ الاسلامی اور تخصص فی الدعوۃ والارشاد کا نصاب اسی اصول کے مطابق وضع کیا تھا۔ دیگر کئی علوم میں تخصصات شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ (۲۸)

حوالہ جات

۱:-المقریزی، احمد بن علی، متوفی، ۱۸۴۵ھ۔المواعظ والاعتبار بذکرالخطوط والآثار، (بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۱۸ھ) جلد:۴، ص:۱۹۹

۲:- بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب المناقب، مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وأصحابہ إلی المدینۃ، رقم الحدیث: ۳۹۰۵ (ریاض- دارالسلام، ۲۰۰۰ء) ص: ۳۱۷-۳۱۸

۳:- الحلبی، علی بن إبراہیم بن أحمد، أبو الفرج، المتوفٰی: ۱۰۴۴ھ، السیرۃ الحلبیۃ = إنسان العیون فی سیرۃ الأمین المأمون (بیروت- دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۲۷ھ) جلد:۱، ص: ۴۶۵

۴:-الحلبی، السیرۃ الحلبیۃ (بیروت-۱۴۲۷ھ) جلد:۱، ص: ۴۶۵

۵:- بخاری، صحیح البخاری، کتاب التفسیر، سورۃ سبح اسم ربک الاعلی۔رقم الحدیث :۴۹۴۱ (ریاض، دارالسلام۲۰۰۰ء)، ص:۴۲۶

۶:- زرقانی، أبوعبداللہ محمد بن عبدالباقی المالکی، متوفی:۱۱۲۲ھ، شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیہ بالمنح المحمدیۃ (دارالکتب العلمیۃ ۱۹۹۶ء)، ج:۲، ص۱۸۶

۷:-مقریزی، الخطط (بیروت-۱۴۱۸ھ) ج:۲، ص:۳۶۲

۸:-المقریزی، کتاب الخطط

۹:-النحل:۱۲:۱۶

۱۰:- بنوری، محمد یوسف، علامہ، نفحۃ العنبر فی حیاۃ الشیخ انور (کراچی-مجلس علمی، ۱۳۸۹ھ-۱۹۶۹ء)، ص:۲۶۶

۱۱:- راقم کو یہ سعات حاصل ہے کہ ۱۹۷۷ء

۱۲:-مختار، ڈاکٹر حبیب اللہ، مولانا، مقدمۃ معارف السنن (کراچی-مجلس الدعوۃ والتحقیق، ت، ندارد)، ج:۱، ص:۸

۱۳:-(مختار، مقدمۃ معارف السنن (مجلس الدعوۃ والتحقیق)، ج:۱، ص۹-۱۱

۱۴:- پشاوری، لطف اللہ، مولانا، نقوش زندگی، بینات، بیادمحدث العصر (کراچی ۱۹۷۸ء) اشاعت خاص، ص: ۳۸

۱۵:-مختار، مقدمۃ معارف السنن (مجلس الدعوۃ والتحقیق)، جلد:۱، ص:۱۱

۱۶:- ایضاً، جلد:۱، ص:۱۲

۱۷:- ایضاً، ج:۱، ص:۲۱ تا ۲۳

۱۸:- ایضاً، جلد:۱، ص:۲۴

۱۹:-کوہاٹی، محمد طفیل، مقالات امین ازافادات مولانا محمد امین اورکزئی شہید (ہنگو، دارالتحقیق جامعہ یوسفیہ ۱۴۴۰ھ) ص:۳۴۲ تا ۳۷۶

۲۰:- مولانا محمد امین اورکزئی، خوان بنوری سے خوشہ چینی، ماہنامہ بینات، کراچی (جمادی الاولیٰ، ۱۴۴۰ھ)، ج: ۸۲، شمارہ: ۵، صفحات ۴۸ تا ۵۸ اور (جمادی الثانیۃ ۱۴۴۰ھ) شمارہ:۶، صفحات:۴۴ تا ۵۱

۲۱:-مختار، مقدمہ معارف السنن (مجلس الدعوۃ والتحقیق)، ج:۱، ص:۱۷

۲۲:- ایضاً، ج:۱، ص:۲۰-۲۱

۲۳:- ایضاً، ج:۱، ص:۴۲

۲۴:- بنوری، صاحبزادہ محمد، حضرت اباجان کا آخری سفر، ماہنامہ بینات بیادمحدث العصر (کراچی ۱۹۷۸ء) اشاعت خاص، ص:۱۵۷

۲۵:-مختار، مقدمہ معارف السنن ۔(مجلس الدعوۃ والتحقیق ۱۹۸۱ء)، ج:۱، ص:۱۳

۲۶:-تفصیل کے لیے دیکھئے، تعارف جامعہ

۲۷:-مفتی احمدالرحمٰن، جامعہ کا دور جدید، بینات بیادمحدث العصر (۱۹۷۸ء) اشاعت خاص، ص:۲۴۹-۲۵۰

۲۸:-مفتی احمدالرحمٰن، جامعہ کا دور جدید، بینات بیادمحدث العصر (۱۹۷۸ء) اشاعت خاص، ص:۲۴۳-۲۴۴

(جاری ہے)

اسلامی معاشرے میں قوانین کی پابندی

مفتی سردار محمد اشرفی

کسی بھی ملک کی ترقی اور تنزُّلی کا راز اس کے قوانین کی پابندی میں مضمر ہوتا ہے۔ مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہمارا پیارا وطن ہے اور الحمد للہ! ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے، اسلام اللہ جل جلالہٗ کا بنایا ہوا نظامِ زندگی ہے جس کی پابندی ہم پر فرض ہے۔ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَلَاتَعْثَوْا فِيْ الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ''.... یعنی ''اللہ کی زمین میں فساد پھیلانے والے مت ہو۔''

لفظِ ''اسلام'' میں سلامتی کا درس ہے اور پھر مذہبِ اسلام پر چلنے والا مسلمان کہلاتا ہے تو لفظِ ''مسلمان'' میں بھی سلامتی کا درس ہے اور جب دو مسلمان آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو ''السلام علیکم'' کہتے ہیں، چنانچہ روزِ روشن کی طرح ثابت ہوا کہ اسلام امن وسکون اور سلامتی کا مذہب ہے۔ مذہب کے دائرے میں رہتے ہوئے ہر معاشرے، ہر قوم اور ہر ملک کے کچھ قوانین اور ضوابط ہوتے ہیں، پُرامن اور پُرسکون زندگی گزارنے کے لیے ان کی پابندی از حد ضروری ہوتی ہے۔

یہ ایک مثبت پہلو ہے اور منفی پہلو یہ ہے کہ قانون توڑنے اور اُصول وضوابط کا احترام نہ کرنے سے افراتفری پھیل جاتی ہے، جن کی بنا پر نہ صرف افراد کا سکون تہہ وبالا ہوجاتا ہے، بلکہ پورے معاشرے اور قوم کی زندگی متأثر ہوجاتی ہے، اس لیے مذہبِ اسلام نے مسلمانوں کو قانون کا احترام اور پابندی کرنے کی تاکید کی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اسلامی معاشرے میں قانون کا کس قدر احترام کیا جاتا تھا، اس کی نہایت عمدہ مثال شراب کی حرمت کے سلسلے میں دیکھنے میں آئی ہے، جوں ہی شراب کی حرمت کا اعلان

کرایا گیا، اسی وقت لوگوں نے شراب کے تمام برتن توڑ دیئے اور شراب مدینے کی گلیوں میں بہہ نکلی اور اسلامی معاشرہ شراب کی لعنت سے پاک ہوگیا اور یہی اللہ جل جلالہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اصل روح اور اسلام کا حقیقی مفہوم ہے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْا الرَّسُوْلَ وَلَاتُبْطِلُوْا أَعْمَالَكُمْ۔‘‘ (محمد:۳۳)

ترجمہ: ’’اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔‘‘

چنانچہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اُصول واحکام اور اس کی روشنی میں بنائے ہوئے تمام قوانین وضوابط کی پوری پابندی اور کامل احترام کرے، اسی طرح ہم ایک اچھے شہری، اچھے پاکستانی اور سچے مسلمان بن سکتے ہیں، جس طرح قدرت کا نظام چند ضروری قوانین کا پابند ہے، اسی طرح معاشرے کا قیام ودوام، معاشرتی، اخلاقی اور دینی احکام وقوانین پر موقوف ہے۔

یوں تو دنیا کا کم عقل سے کم عقل انسان بھی قانون کی ضرورت، اس کی پابندی اور اہمیت کا اعتراف کرے گا، لیکن کم لوگ ایسے ہیں جو عملاً قانون کے تقاضے پورے کرتے ہوں، عصرِ حاضر میں دو افراد کے باہمی معاملات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک لوگ ضوابط اور قوانین کی پابندی سے گریزاں ہیں اور لاقانونیت کے اس رجحان نے دنیا کا امن وسکون غارت کردیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان قانون کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اس کی خلاف ورزی کیوں کرتا ہے؟ اس کی چند وجوہ ہیں:

۱:- اسلامی تعلیمات سے روگردانی۔
۲:- خود غرضی اور مفاد پرستی۔
۳:- اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنا۔
۴:- حب الوطنی سے بے توجہی۔
۵:- امن وسلامتی کی ناقدری۔

چنانچہ اسلام ان سب وجوہ کا خوبی سے تدارک کرکے مسلمانوں کو قانون کا پابند بناتا ہے، بایں وجہ ایک طرف وہ انہیں خدا پرستی اور ایثار وسخاوت اور اکرامِ مسلم کا درس دیتا ہے تو دوسری طرف ان میں آخرت کی جواب دہی کا احساس وشعور پیدا کرتا ہے اور انہیں احساس دلانا چاہتا ہے کہ اگر وہ اپنے اثر ورسوخ یا دھوکے فریب سے دنیا میں قانون کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ بھی گئے تو آخرت میں اُنہیں خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

آخرت میں جواب دہی کا یہی احساس اسلامی معاشرے کے گناہ میں ملوث ہوجانے والے افراد کو ازخود عدالت میں جانے پر مجبور کرتا ہے اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انہیں دنیا ہی میں سزا دے کر

پاک کر دیا جائے، تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائیں۔ لوگوں کے دلوں میں قانون کے احترام کا سچا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خود حکمران طبقہ بھی قانون کی پاسبانی کرے اور اپنے اثر ورسوخ کو قانون کی زد سے بچنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی دستور یا آئین ایسا ہو جس میں حکمران طبقے کو مخصوص مراعات مہیا نہ ہوگئی ہوں اور قانون میں آقا وغلام، شاہ اور گدا کا کوئی امتیاز نہ ہو۔

اسلامی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زرہ گم ہوگئی اور ایک یہودی کے پاس ملی، خود خلیفۂ وقت ہونے کے باوجود آپؓ اسے قاضی کی عدالت میں لے گئے، چنانچہ جب قاضی نے آپؓ سے گواہوں کا مطالبہ کیا تو خلیفۂ وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے اور غلام کو پیش کیا۔ قاضی نے دونوں کی گواہی ان سے قریبی تعلق کی بنا پر قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپؓ اپنے دعوے سے دستبردار ہوگئے۔ احترامِ قانون کے اس فقید المثال واقعے نے یہودی کو اتنا متأثر کیا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔

اسلامی معاشرے میں نماز کے اندر قانون کی پابندی کی دلکش تصویر موجود ہے، ایک صف میں کھڑے ہوکر ایک قبلے کی طرف رُخ کر کے ایک امام کی اقتداء میں قیام، رکوع اور سجود، زید، عمرو، بکر، محمود وایاز سب مل کر ہمیں قانون کی پابندی سکھاتے ہیں اور دلوں میں احترامِ قانون کا احساس پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح رمضان المبارک میں روزہ رکھنا احترامِ قانون کا حسین نقشہ ہے۔ حکمِ خداوندی کے تحت صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک مفطراتِ ثلاثہ (اکل، شرب اور بعال یعنی جماع) سے مطلق پرہیز یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمان اپنے خالقِ حقیقی کا مطیع اور فرماں بردار ہے۔ حج بھی اسی قوانین کی پابندی کا ایک دلنشین نظارہ ہے۔

دنیا میں جہاں کہیں امن وسکون ہے، اس کا راز یہی ہے کہ وہاں کے باشندے قانون کے پابند ہیں، جہاں کہیں بگاڑ وانتشار ہے، بدامنی اور پریشانی ہے، وہاں قانون شکنی کی حکمرانی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے بدنِ انسانی ہمارے سامنے ہے کہ جب جسم کے نظام میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے تو بیماری لاحق ہوجاتی ہے اور بدنِ انسانی کا چین وسکون غارت ہوجاتا ہے۔ فتحِ مکہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے تحت ان گھروں اور باغوں پر بھی قبضہ نہ کیا جن کو وہ ہجرت کے وقت چھوڑ گئے تھے، جو کہ قانون کی پابندی کی زندہ مثال ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

خلیفہ بلافصل سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ احادیث کی روشنی میں

مولانا محمد مجاہد بن خلیل
متخصصِ علوم حدیث، جامعہ فاروقیہ، کراچی

اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد جس جماعت کو مقدس، محترم، ذی شان بنایا ہے، وہ جماعت ان عظیم ہستیوں کی جماعت ہے جنہوں نے ایمان کی حالت میں امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے، اور ایمان پر ہی خاتمہ ہوا ہو۔ اس جماعت کو حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقدس لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی افضلیت کی جانب حدیثِ مبارکہ میں واضح اشارہ ملتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''**لاتسبوا أصحابي ، فلو أن أحدكم أنفق ذهباً ما بلغ مد أحدهم ولا نصيفه.**''

(الجامع الصحیح للبخاری، ج: ۵، ص: ۸، رقم الحدیث: ۳۶۷۳)

''میرے صحابہؓ کو برا بھلا مت کہو، اگر تم میں سے کوئی ایک اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کرے تب بھی میرے صحابہؓ کے مد کے اور نہ ہی نصف کے برابر پہنچ سکتا ہے۔''

ویسے تو ہر صحابیؓ کی شان نرالی ہے، ہر صحابیؓ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے، لیکن ان میں بعض کو بعض پر فوقیت حاصل ہے، جیسا کہ صاحبِ ''**الجوهر الهريرية من كلام خير البرية**'' نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک نقل کیا ہے:

''**بعضهم أي من الصحابة رضي الله عنهم أقوى من بعض**'' (الجوہر الہریریۃ لأبی یوسف محمد زید، ج: ۴، ص: ۳۰)

قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر شانِ صحابہؓ کو بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

’’وَالسَّابِقُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔‘‘ (التوبۃ:۱۰۰)

’’مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ پہلے ایمان لائے اور جنہوں نے نیکی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔‘‘

اس کے علاوہ بے شمار آیات ہیں، جن میں شانِ صحابہؓ کو اُجاگر کیا گیا ہے۔لیکن ان تمام میں سب سے اعلیٰ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذاتِ گرامی ہے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت کو قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔’’مشتے نمونہ از خروارے‘‘ کے طور پر ذخیرۂ احادیث میں سے فضائلِ صدیقِ اکبرؓ کے چند نمونے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیل

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو یہ تمغہ حاصل ہے کہ امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو اپنا خلیل بنانے کی آرزو کی ہے، جیسا کہ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۷۳ھ) اپنی کتاب ’’سنن ابن ماجہ‘‘ میں روایت کرتے ہیں:

’’قال رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم: ’’ولو كنت متخذاً خليلاً، لاتخذتُ أبابكر خليلاً.‘‘

(سنن ابن ماجہ، ج:۱،ص:۷۰، رقم الحدیث:۹۳)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں کسی کو دوست بناتا، تو ابوبکرؓ کو دوست بناتا۔‘‘

امام ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن الحسنؒ (متوفی ۴۱۸ھ) اس بات کو مزید وضاحت سے نقل کرتے ہیں، جیسا کہ آپ اپنی کتاب ’’شرح أصول اعتقاد أهل السنة والجماعة‘‘ میں روایت کرتے ہیں:

’’عن ابن عباس رضي اللّٰه عنه خرج رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم عاصباً رأسهٗ بخرقة في مرضه الذي مات فيه ... قال: ’’لو كنت متخذًا من الناس خليلاً، لاتخذت أبابكرؓ.‘‘ (شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ، ج:۷،ص:۳۴۷، رقم الحدیث:۲۴۰۸)

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اس مرض میں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کا انتقال ہوا اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر کپڑے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میں لوگوں میں سے کسی کو دوست بناتا، تو میں ابوبکرؓ کو دوست بناتا۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا تعلق تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنا دوست بنانے کی بات کر رہے ہیں۔

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد مخلوق میں سب سے افضل (خير الخلائق بعد الأنبياء)

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ روئے زمین پر انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد سب سے افضل انسان ہیں، اسی بات کی جانب امام الأنبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے، جس کو امام ابوبکر بن ابی عاصم الشیبانیؒ (متوفی: ۲۸۷ھ) اپنی کتاب ''كتاب السنة'' میں روایت کرتے ہیں:

''عن أبي الدرداء قال: رأني رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم وأنا أمشي بين يدي أبي بكر، قال: ''لِمَ تمشي أمام من هو خير منك؟ إن أبابكر خير من طلعت عليه الشمس وغربت.'' (کتاب السنۃ، ج:۲،ص:۵۷۵، رقم الحدیث:۱۲۲۴)

''حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا اس حال میں کہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آگے چل رہا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو اس کے آگے کیوں چل رہا ہے جو تم سے بہتر ہے؟ (اس کے بعد فرمایا) جتنے لوگوں پر سورج طلوع ہوتا ہے ان تمام میں حضرت ابوبکرؓ سب سے افضل ہیں۔''

اسی طرح امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۲۴۱ھ) اپنی کتاب ''فضائل الصحابةؓ'' میں اس بات کو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حوالے سے مزید واشگاف الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

''خطبنا عليؓ على هذا المنبر، فحمد اللهَ وذكرهٗ ماشاء الله أن يذكرهٗ ...فقال: ''إن خير الناس بعد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم أبوبكر.'' (فضائل الصحابۃؓ، ج:۱،ص:۳۵۵، رقم الحدیث:۴۸۴)

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ ایک دن خطبہ کے لیے منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: بے شک لوگوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی ذاتِ گرامی ہے۔''

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں، اس بات کے نہ صرف اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معترف تھے، بلکہ سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ

کو افضل الخلائق بعد الأنبیاء تصور کرتے تھے۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کے ساتھ محبت کے دعویداروں کو اُن کے اس فرمان پر غور کرنا چاہیے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق

ہر صحابیؓ جنتی ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے اپنی رضا اور خوش نودی کا اعلان کیا ہے، لیکن بعض ایسے بھی خوش نصیب ہیں، جنہیں نبوت نے اپنی زبانِ مبارک سے نام لے کر جنتی ہونے کی بشارت دی، جیسے: عشرہ مبشرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ان خوش نصیب افراد میں سے ہیں جن کو نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جنت میں اپنا رفیق ہونے کی بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں، جیسا کہ امام ابوبکر محمد بن حسین الآجری بغدادیؒ (متوفی ۳۶۰ھ) اپنی کتاب ''الشریعة'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی طرح کا فرمان نقل کرتے ہیں:

''عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ ، قال: رفع رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم یدہٗ، وقال: ''اللّٰھم اجعل أبابکر معي في درجتي یوم القیامة، فأوحٰی إلیه أني قد استجبت لک.''

(الشریعة، ج:۴،ص:۱۷۸۷،رقم الحدیث:۱۲۷۵)

''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) اپنے ہاتھ کو (اللہ کے دربار میں) اُٹھایا اور فرمایا: اے اللہ! ابوبکر کو قیامت کے دن میرے ساتھ درجہ عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی گئی کہ ہم نے آپ کی دعا کو قبول کرلیا ہے۔''

اس ارشادِ مبارک سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہوں گے، کیوں کہ اس کی نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول بھی کیا ہے۔

ذخیرۂ احادیث میں سے چند احادیث آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل اور منقبت پر دال ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

.....❁.....❁.....❁.....

حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا عبدالمتین منیری
بھٹکل، انڈیا

عموماً دیکھا جاتا ہے کہ خاندانوں کے کئی ایک بزرگ خاموش سے رہتے ہیں، ان کی آواز کم کم ہی کانوں میں پڑتی ہے، لیکن جب وہ اس دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی قیامت سی ٹوٹ پڑی ہے، یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ داماں ہوگئی ہے، ایک ویرانی سی چاروں طرف فضاؤں میں بکھرتی نظر آتی ہے اور دور تک خلا سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر ۱۶ جنوری کی صبح کو جب ملی تو کچھ ایسا ہی لگا۔ ایک خاموش، لیکن عظیم شخصیت کے دنیا سے اچانک اس طرح رخصت ہونے کا گمان بھی نہیں تھا، لیکن قدرت کی ہونی کو کون ٹال سکتا ہے، مرنے کا ایک وقت مقرر ہے، ہم جیسے کورے دماغ اسے اچانک سمجھ بیٹھتے ہیں۔

آپ نے عمرِ عزیز کی ۸۵ بہاریں اس دنیائے فانی میں دیکھیں، ۱۹۳۳ء میں سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی بستی ’’تکیہ کلاں، رائے بریلی‘‘ میں آنکھیں کھولی تھیں۔ والد ماجد سید رشید حسنی صاحب زمیندار تھے، مؤرخِ ہند علامہ حکیم عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے نانا تھے، جن کی چھوٹی بیوی محترمہ خیرالنساء بہتر رحمۃ اللہ علیہا آپ کی نانی تھیں، اس رشتے سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کے سگے ماموں تھے، آپ کا مکان ننھیال سے لگا ہوا تھا، لہٰذا آپ نے اپنی نانی صاحبہ اور خالہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کے آغوشِ تربیت میں بچپن کا دور گزارا۔

اس گھر کا ماحول اگر دینداری کا نمونہ نہ ہوتا تو آخر اور کونسا گھر ہوتا؟ گھرانے کے سبھی لوگ مروت اور اخلاق کے پتلے اور اسلاف کی سیرت کے اعلیٰ نمونے، اس گھرانے سے جڑے ہوئے تھے۔ بچپن ہی سے نماز کی پابندی کا اہتمام ہوتا، اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ گھر کا ماحول زمیندارانہ

ہونے کے باوجود کہیں احساسِ برتری کو اُجاگر ہونے کی جگہ نہ تھی، خادمائیں اور خالائیں بھری پڑی تھیں، لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ کسی کا دل نہ دُکھنے پائے، زبان سے کسی کی تحقیر کا کوئی جملہ نہ نکلے۔ اگر کبھی زبان درازی تک نوبت پہنچی اور ہاتھ اُٹھا تو پھر والدین معافی مانگنے کو کہتے، خالہ نے جو خود بہترین عالمہ اور مصنفہ تھیں، قرآن پڑھایا، گیارہ سال کی عمر تک گاؤں ہی کے قریب ''مدرسہ الٰہیہ'' میں ابتدائی تعلیم مکمل ہوئی، جب شعور پروان چڑھنے لگا تو سامنے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ دو ماموؤں کی زندگی نمونہ بنی، حالانکہ آپ کے ددھیالی رشتے کے افراد عصری تعلیم کی طرف مائل تھے، آپ کے چچا احمد برطانیہ سے بیرسٹری کی ڈگری لے کر لوٹے تھے۔

مکتب کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد ان دونوں کے مشورے سے ۱۹۴۵ء میں داخلہ ندوۃ العلماء کے درجہ عربی اول میں ہوا، اس وقت یہاں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''معتمدِ تعلیمات'' کے منصب پر فائز تھے، اور مولانا محمد عمران خان ندوی مہتمم تھے، شیخ التفسیر مولانا محمد اویس نگرامیؒ ترجمۂ قرآن پڑھاتے تھے۔ علامہ عموماً درجات میں آتے تو طلبہ سے بات چیت ضرور کرتے، ان کی باتیں ہمیشہ کتابوں کے بارے میں ہوتی تھیں کہ فلاں کتاب پڑھی ہے یا نہیں؟ اکابر عموماً علم و کتاب ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔

اس وقت ندوے میں عربی میڈیم کا تجربہ کیا جا رہا تھا، اساتذہ میں سے مولانا محمد عمران خان اور مولانا محبوب الرحمٰنؒ ازہر شریف سے پڑھ کر آئے تھے۔ یہ دونوں طلبہ سے عربی ہی میں بات چیت کیا کرتے تھے، طلبہ سے کہتے کہ عربی ہی میں بولو۔ کچھ نہیں تو الف لام ہی ہر لفظ پر لگالو۔ کورس کے لیے کتابیں دستیاب نہیں تھیں، ''**المحاورة العربية، قصص النبيين، القراءة الراشدة**'' وغیرہ ابھی تصنیف نہیں ہوئی تھیں، لے دے کے عربی ریڈروں میں مصر کی ''**القراءة الرشيدة**'' تھی۔

مولانا محبوب الرحمٰن صاحب ''**المحاورة العربية**'' عملی انداز میں بغیر کتاب کے زبانی یاد کرواتے تھے، باغ میں لے جاتے، ٹوکری میں سیب اور کیلے رکھے ہوتے، کہتے: ''**هٰذا موز، هٰذا تفاح، هٰذا حجر، هٰذا شجر، هٰذا نهر، سمك يسبح في الماء**'' آپ فرماتے تھے کہ: زبان آنے کے لیے اس سے محبت ہونی چاہیے، ''**حب اللغة**'' ہی بنیاد ہے، اساتذہ کے پڑھانے کا انداز دلچسپ ہوتا تھا، اور سوالات کے ذریعہ زبان اس طرح سکھائی جاتی تھی کہ آپ کو عربی کتابوں سے محبت سی ہوگئی، لہٰذا اُردو سے زیادہ عربی کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہیں۔ مولانا عمران صاحب عربی میں قصے سناتے تھے، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اس وقت تدریس چھوڑ کر تصنیف اور دعوتی کام سے وابستہ

ہو چکے تھے، لیکن درجات میں حاضری ضرور دیتے تھے، سوالات بلیک بورڈ پر لکھتے اور جوابات پوچھتے اور جملے بنانے کی مشقیں کیا کرتے تھے، مولانا مصطفیٰ بستوی نحوز بانی پڑھاتے تھے، تجوید کے استاذ مولانا قاری محی الدین صاحب تھے، قاضی عین القضاۃ فرنگی محلی کے شاگرد مولانا اسباط صاحب بھی یہاں تھے، ابوداوٗد اور ہدایہ ان کے ذمہ تھی، شیخ الحدیث مولانا محمد اسحاق سندیلوی کا شمار بڑے اساتذہ میں ہوتا تھا، ندوہ ابھی مختصر تھا، آپ کا سبھی اساتذہ کے ساتھ احترام کا تعلق قائم رہا، لیکن استاذِ ادب مولانا عبدالحفیظ بلیاوی مصنفِ ''مصباح اللغات'' سے آپ کے تعلقات کی نوعیت ہی جداگانہ تھی، آپ ان کی خلوت وجلوت میں شریک رہتے، مولانا بلیاوی علم وادب کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھے، جاہلیت کے اشعار انہیں بے تحاشا از بر تھے، بیسیوں دواوین حافظے میں محفوظ تھے، آپ فرمایا کرتے تھے کہ: طالب علم کو موضوع سے مناسبت ہو جائے تو جی لگا کر پڑھنے میں پریشانی نہیں ہوتی، کامیاب استاذ وہ ہوتا ہے جو سبق کو آسان کر دے، عالمیت میں آپ کے گیارہ اور فضیلت میں صرف دو ساتھی تھے۔

ان دنوں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نائب معتمدِ تعلیمات تھے، طلبہ میں آپ کے خطابات ہوا کرتے تھے، جن میں دینی ماحول کے قیام پر آپ کی توجہ زیادہ تر مرکوز رہتی تھی۔ اس زمانے میں نصابِ تعلیم مسلسل تبدیل ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے کبھی کبھار ایک ہی درجہ میں دو دو سال رہنا پڑتا تھا، ندوہ شہر سے دور تھا، شام گئے سناٹا چھا جاتا تھا، کل ملا کر شبلی ہاسٹل کی پہلی منزل، مین بلڈنگ، یہی کل کائنات تھی، طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب رہی ہوگی، پچاسی سالہ جشن کے بعد طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی، اب عالمیت میں طلبہ کی تعداد سات سو کے قریب ہونے لگی ہے۔

اس زمانے میں کتب خانہ سے استفادہ پر زور دیا جاتا تھا، اساتذہ سے خارج اوقات میں بھی سیکھنا آسان تھا، مولانا بلیاوی سے الگ سے بھی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، آپ سے کافیہ، شافیہ، اوضح المسالک، المفصل اور شرح ابن عقیل حرف بہ حرف پڑھیں، جس کی وجہ سے نحو آپ کا محبوب ترین مضمون بن گیا تھا۔ مولانا بلیاوی کو آپ سے اتنی محبت تھی کہ گھر میں کوئی خاص چیز پکتی تو ضرور یاد کرتے۔ آپ ہی نے ایامِ عرب سے بخوبی واقفیت کے لیے قبائلِ عرب سے واقفیت پر توجہ دلائی تھی، کیونکہ اس کے بغیر حماسہ وغیرہ سمجھنا ممکن نہیں ہوتا، اس کے لیے مولانا واضح صاحب نے قبائل کے انساب کے باقاعدہ چارٹ بنادیئے تھے، ندوے سے آپ کی فراغت ۱۹۵۱ء میں مکمل ہوئی۔ رمضان کی تاریخیں قریب تھیں، آپ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہاں سے حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں اور یہیں بیعت وسلوک کا تعلق آپ سے قائم ہوا،

یہ رمضان آپ نے مسوری میں گزارا۔

شوال میں آپ دہلی روانہ ہوئے، جہاں آپ کے عزیز مولانا ابوبکر حسنی آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے، اس زمانے میں ریڈیو میں زیادہ تر عرب صحافی کام کیا کرتے تھے، جو خبروں کا ترجمہ لکھ کر چلے جاتے تھے، لہٰذا براڈ کاسٹرس کی اسامیاں خالی ہوگئی تھیں، اس وقت مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم عربی سروس کے سربراہ تھے، وہ ندوے میں پڑھ کر ازہر شریف گئے تھے، ان کے مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ قریبی روابط تھے، وہ ''ثقافة الهند'' کے مدیر بھی تھے، انہوں نے آپ کا انٹرویو لیا، آواز کا ٹیسٹ لیا گیا اور تقرری کی منظوری میں کوئی دیر نہیں لگائی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ کو صحافت کے میدان سے وابستہ عرب اہلِ قلم کے ساتھ رہنے اور ان سے عالمِ عرب کے حالات گہرائی سے جاننے، سمجھنے اور جدید عصری زبان پر عبور حاصل کرنے کا موقع مل گیا، ریڈیو میں آپ نے اکیس سال گزارے۔

مولانا نے جب ریڈیو سے وابستگی اختیار کی تھی تو یہ بڑا ہنگامہ خیز دور تھا۔ مشرقِ وسطی میں نہر سویز کی جنگ چھڑ رہی تھی اور جنرل جمال عبدالناصر عربوں کے ہیرو بن کر اُبھر رہے تھے۔ عرب قومیت کا نعرہ اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ سوریہ اور مصر کے مابین اتحاد قائم ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں پنڈت جواہر لال نہرو کی وزارتِ عظمیٰ کا بھی یہی زمانہ تھا۔ عرب دنیا نہرو جی کا بڑا احترام کرتی تھی، اور ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتی تھی، جس کی وجہ سے عرب رہنماؤں سے آپ کے بڑے گہرے روابط استوار تھے، جس سے ہندوستان میں عرب رہنماؤں کی آمد تواتر سے ہونے لگی تھی، بڑے تزک و احتشام سے ان کا استقبال ہوتا تھا، اسٹیڈیموں میں ان کی تقاریر رکھی جاتی تھیں، مصر کے جنرل ناصر آئے، شام کے شکری القوتلی آئے، جمعہ کی نماز ساتھ ہی میں پڑھی، مولانا کو مختلف پروگراموں میں ان قائدین سے قریب ہونے اور اسٹیج کے پاس ہی رہنے کا موقع ملتا تھا۔ ریڈیو ٹاک اور انٹرویو لینے کے لیے آپ ہی کو فوقیت دی جاتی تھی، اس دوران سعودی فرماں روا ملک سعود بن عبدالعزیز بھی آئے جن کا ریڈیو ٹاک آپ ہی نے رکھا تھا۔ لال قلعہ میں جو سربراہانِ مملکت کا استقبالیہ رکھا جاتا تھا، اس میں آپ کی شرکت لازمی ہوتی تھی۔ مصری قاریوں کی بھی اس زمانے میں بڑی مانگ تھی، یہ حضرات بھی ریڈیو کی دعوت پر آتے اور اپنی تلاوتیں ریکارڈ کرواتے تھے۔

ریڈیو کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر ہر جمعرات کو حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت جی مولانا انعام الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جانے کا مولانا اہتمام کرتے تھے، حضرت جی مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ گجرات اور بھوپال سفر کرنے کا بھی آپ کو موقع ملا۔ دہلی میں

حضرت شیخ بھی تشریف لاتے تھے، انہیں دنوں آپ نے ''فضائلِ صلاۃ'' اور ''فضائلِ درود'' کا عربی میں ترجمہ مکمل کیا، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ سے دلی لگاؤ تھا اور آپ سے تجدیدِ بیعت کی آپ کی خواہش تھی، لیکن حضرت شیخ جن لوگوں کا حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا تعلق ہوتا تھا، ان سے بیعت نہیں لیتے تھے، لیکن آپ سے تربیتی تعلق آخر تک قائم رہا۔

۱۹۷۳ء میں جب حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سفرِ حج بیت اللہ پر روانہ ہوگئے تھے اور وطن میں نہیں تھے، گرمی کا زمانہ تھا، اس دوران ایک مہینے کی چھٹی پر آپ ندوہ آگئے، مولانا محبّ اللہ لاری ندوی رحمۃ اللہ علیہ مہتمم تھے، آپ نے سوچا کیوں نہ واضح صاحب کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جائے؟! لہٰذا آپ کو ادبِ عربی کے گھنٹے لگا دیئے گئے، تعطیل جب ختم ہوگئی اور واپسی کا وقت آیا تو ندوے کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، یہاں مسجد میں بیٹھ کر ندوے کے فراق میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اس وقت آپ کے دل پر فراغت کے وقت سے زیادہ مادرِ علمی سے فراق کا غم تھا، اسی وقت آپ نے فیصلہ کیا کہ اب ریڈیو اسٹیشن واپس نہیں جانا ہے، حضرت شیخ سے مشورہ کیا تو جواب آیا کہ تمہیں تو ندوے کو چھوڑ کر پہلے ہی نہیں جانا چاہیے تھا، ندوہ تمہاری اصل جگہ تھی، استعفاء پر ریڈیو انتظامیہ کو حیرت ہوئی، کیوں کہ وہاں پر بڑی تنخواہ ملتی تھی، دیگر سہولتیں الگ تھیں، پانچ مہینے انکوائری چلی کہ کہیں دوسرا بہتر کام تو نہیں ملا؟ اس طرح آپ نے آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ان سہولتوں کو چھوڑ کر ندوے کی ملازمت کا آغاز کیا۔ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب نے اس بڑے فیصلے پر اختلاف نہیں کیا، گھر والوں نے بھی آسائشوں اور سہولتوں کی قربانی کو ہنسی خوشی قبول کیا۔

یہی زمانہ تھا جب مولانا سید واضح رشید ندوی صاحبؒ کا نام پہلے پہل اس ناچیز کے کانوں میں پڑا تھا، ہوا یہ تھا کہ ہمارے عزیز مولوی عبدالصمد قاضی نے جو اس وقت ندوے میں عالمیت کے درجے میں پڑھ رہے تھے، تعطیلات میں بھٹکل آئے تو بتایا کہ: ندوے میں ایک ماہر عربی استاذ کی تقرری ہوئی ہے، جنہیں جدید عربی زبان لکھنے اور بولنے پر زبردست عبور حاصل ہے، اس وقت جی بہت للچایا اور اس محرومی کا احساس بھی بہت ستایا، دراصل جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے قیام سے یہاں سے طلبہ عربی چہارم مکمل کر کے ندوے میں داخلہ لیتے تھے، ۱۹۶۹ء کی اسٹرائیک کی وجہ سے جو حالات پیدا ہوئے، اس کے معاً بعد جس درجہ کو ندوے جانا تھا، وہ وہاں نہ جا سکا تھا، اس درجے میں سے صرف مولانا ناصر الاسلام ندوی ہی اکیلے طالب علم تھے جو بعد میں یہاں داخلہ لے سکے تھے، ناصر صاحب کے والد محمد

باشا شرالی مرحوم' حضرت مولاناؒ کے بڑے عقیدت مند تھے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ بھی آپ کو بہت چاہتے تھے، گرمیوں میں جب بھٹکل آتے تو کبھی کبھار آپ ہی کے گھر پر ہنگاموں سے دور چند دن سکون سے تصنیف و تالیف میں گزارتے تھے۔ جامعہ میں ندوے کا کورس جاری تھا، طلبہ کو اس ادارے سے اور یہاں کے اساتذہ سے بہت اُنس تھا، وہ یہاں کے حالات سے باخبر رہتے تھے، طلبہ میں اس تعلق کو قائم کرنے میں نئے نئے نامزد ہمارے استاذ مولانا ملا محمد اقبال ندوی صاحب کا بھی بڑا ہاتھ تھا، اسٹرائیک کے بطن سے ایک نئے ندوے نے جنم لیا، مولانا واضح صاحب کی ندوے سے وابستگی بھی اس کی نشأتِ ثانیہ کا آغاز تھی، جس کی برکتیں آج تک محسوس کی جارہی ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی منتقلی جامعہ آباد کے ویرانے میں ہوئی، افتتاح سرپرستِ جامعہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں ہوا، یہ ہاتھ ایسے بابرکت ثابت ہوئے، دعاؤں نے ایسا اثر دکھایا کہ یہ ''وادي غیر ذي ذرع'' لہلہاتے باغ میں تبدیل ہوگئی، یہی موقع تھا کہ مولانا واضح صاحب پہلی مرتبہ یہاں تشریف لائے تھے، لیکن آپ کی موجودگی کو اس وقت محسوس نہیں کیا گیا، عوامی جلسوں میں بولنے اور خود کو اُجاگر کرنے کی جو عادت ان میں نہیں تھی، اس سے پہلے ۱۹۶۷ء میں جامعہ آباد کے سنگِ بنیاد کے موقع پر آپ کے بھائی سید محمد الحسنی مرحوم بانی مدیر ''البعث الإسلامي'' بھی تشریف لائے تھے، وہ بھی ایسے ہی خاموش، لیکن تھے قلم کے دھنی، شاید ان کے والد ماجد نے ان دونوں بیٹوں کو اپنی خاموشی ورثے میں دی تھی۔ اس وقت واضح کی زیارت نصیب میں نہیں لکھی تھی۔ لیکن ''الرائد'' کے ذریعہ آپ کی تحریروں سے دماغ کو روشنی اور دل کو ٹھنڈک مل رہی تھی۔ مولانا جدید عربی صحافت کے لب و لہجے کو جس طرح برتتے تھے، وہ آپ ہی کا خاصہ تھا، اس وقت اس کی دوسری مثال برصغیر میں نہیں ملتی تھی، آپ نے جلیل القدر ماموں جان کے نقشِ قدم پر چل کر عربوں سے جی جان کر محبت کی، اور انہیں اسلام سے وابستہ رہ کر ماضی کی عظمتوں تک لوٹانے کی ہمیشہ فکر کرتے رہے، اور اس کے لیے اپنی بھرپور صلاحتیں صرف کیں۔ بحیثیت مربی ومعلم ندوے سے وابستگی کے آخری ۴۵ سالوں میں آپ نے اپنی توجہات، فکر، علم و تجربے سے اس چمن کی آبیاری کی، اور آپ کی رہنمائی میں یہاں سے اس دوران ایک ایسی نسل پروان چڑھی جس پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

مولانا سے اس ناچیز کا پہلا باقاعدہ رابطہ ۱۹۸۰ء میں قائم ہوا، ہوا یوں کہ جب بھٹکل میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا تو عرب دنیا کے مجلّات میں مختلف خطیبوں کے کیسٹوں کے اشتہارات پڑھنے کو ملتے تھے، اس وقت تو اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اس سلسلے کو شروع کیا جائے، لیکن دل میں اس

کام کے شروع کرنے کی ایک اُمنگ تھی، اللہ تعالیٰ نے جب ذریعۂ معاش دبئی میں رکھ دیا تو یہاں پر قدیم مدرسہ احمدیہ کے ایک کمرے میں قائم لائبریری میں احباب کے ساتھ مل کر اکابرین کی کیسٹوں کی لائبریری کا قیام عمل میں لایا گیا، اس کے لیے یہاں کی ''وزارة الإعلام'' سے باقاعدہ لائسنس بھی حاصل کیا گیا، اور پیغامِ اسلام کیسٹ سیریز کے نام سے اپنی نوعیت کا اولین سلسلہ شروع کیا گیا، اس سلسلے میں اس زمانے کی بڑی شخصیات حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب رحمۃ اللہ علیہ، اور مفکرِ اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی خطوط لکھے گئے، جن میں پہلا ہمت افزا جواب حضرت مولانا سید محمد واضح رشید رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، مولانا نے نہ صرف حضرت مولانا کی طرف سے جواب دیا، بلکہ اس وقت جتنے کیسٹ دستیاب تھے وہ سب فراہم کردیئے، اخراجات کے لیے جو معمولی سی رقم بھیجی گئی تھی، اس میں سے سو پچاس روپے شاید بچ گئے تھے، ایک عرصہ تک جب بھی ملاقات ہوتی رہی، تذکرہ کرتے رہے کہ کچھ رقم بچی ہے، وہ لے جائیں، ہمت افزائی اور حساب کتاب میں اس باریکی کی مثالیں اب شاید ہی مل سکیں۔

جب وہ بھٹکل آتے تو سب سے پہلے جامعہ کے کتب خانے میں جاتے اور نئی کتابوں کا پوچھتے، اس کتب خانے سے انہیں بڑا لگاؤ تھا، دراصل ۱۹۸۱ء میں جناب محیی الدین منیری رحمۃ اللہ علیہ نے ناظم جامعہ بننے کے بعد کتب خانے کی بلڈنگ کی تعمیر پر توجہ دی اور ۱۹۸۵ء میں جب اس کی عالی شان عمارت تکمیل کو پہنچی تو اس میں کتابوں کی صرف دو ایک الماریاں ہی پڑی تھیں، مرحوم نے مجھے ہدایت کی کہ یہ تمہارا میدان ہے، اس کی ذمہ داری اپنے سر لو، اس وقت ہمارے ذہن میں اللہ نے بات ڈال دی کہ کتابوں کی کثرتِ تعداد کی زیادہ اہمیت نہیں ہے، طلبہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ فرضِ کفایہ ادا کرنے کی کوئی سبیل نکلنی چاہیے اور ایسے مواد کی فراہمی پر توجہ دینی چاہیے جن کی دوسرے کتب خانوں میں موجودگی کا امکان کم ہو، اللہ نے توفیق دی، راہیں کھل گئیں، ایسی کتابوں کی معقول تعداد کے ساتھ ساتھ مجلّات: **المنار، الزهراء، المسلمون، حضارة الإسلام، الرسالة** وغیرہ انیسویں صدی سے جاری اسلامی وادبی نشأۃِ ثانیہ میں کردار ادا کرنے والے مجلّات کی مکمل فائلیں یہاں اکٹھی ہوگئیں، ہیرے کی قیمت جوہری ہی جانے، یہاں آنے والے بزرگان میں حضرت مولانا علی میاںؒ، مولانا واضح رشید صاحبؒ اور مولانا نذر الحفیظ ندوی صاحبؒ کی جیسی دلچسپی اس میں دیکھی، ایسی کوئی اور نظر نہیں آئی، انہیں حضرات کی نظرِ عنایت نے مزید ہمت دلائی۔

مولانا جب بھی بھٹکل آتے تو اس ناچیز کے بارے میں ضرور دریافت کرتے کہ یہاں پر موجود ہیں یا نہیں؟ فون پر بات ہوتی تو کہتے آپ کے یہاں آئے ہیں اور آپ نہیں ہیں، اس اپنائیت

اور محبت سے دل کٹ کے رہ جاتا، لیکن کیا کرتے ملازمت کی بندشیں کچھ ایسی ہوتیں کہ بغیر ترتیب کے ان حضرات کی اچانک بھٹکل آمد پر حاضری نہ ہو پاتی، اور دل مسوس کر رہ جاتا۔

میری کمزوری رہی ہے کہ بڑوں کے سامنے دلچسپی دیکھ کر ہی اپنے علمی وادبی ذخیرہ کا تعارف کرتا ہوں، بھٹکل میں اکابر آتے ہیں تو ایک بھیڑ بھڑ کا رہتا ہے، اپنے شہر میں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

مولانا سے جب بھی بھٹکل یا لکھنؤ میں ملاقات ہوتی تو کہتے کہ آپ کے کتب خانے میں جو چیزیں ہیں وہ ہمارے یہاں نہیں ہیں، ندوے کا بھی خیال رکھا کیجیے۔ تین سال قبل ہمارے عزیز مولوی عبد المعز منیری نے اپنے نانا کے نام پر ندوے میں دار المطالعہ قائم کیا تو بڑے خوش ہوئے، دلی دعائیں دیں۔ مولانا کم گو تھے، لوگ سمجھتے تھے کہ مولانا اُنہیں نہیں جانتے، لیکن ایسا نہیں تھا، وہ یہاں آتے تو جامعہ کی باریک باریک چیزوں پر آپ کی نظر ہوتی، وہ یہاں کی رگ رگ سے واقف تھے، یہاں پر جو لوگ شہرت اور ناموری کی خواہش سے بلند ہو کر خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کی انہیں مکمل جانکاری ہوا کرتی تھی، جس کا اندازہ مولانا سے بات چیت پر ہوا کرتا تھا۔

ندوے میں ایک یک جان دو قالب ہونے اور نام ونمود سے بلند ہو کر اپنے رفقاء کی سربلندی کے لیے قربانی دینے والوں کی کئی ایک سنہری مثالیں موجود ہیں، ان میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ساتھی مولانا مسعود علی ندویؒ، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے رفیق مولانا معین اللہ ندوی صاحبؒ اور پھر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم کے بھائی اور رفیق مولانا سید محمد واضح رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، ایسی رفاقتوں کی مثالیں تاریخ میں شاذ ونادر ہی نظر آئیں۔ یہ یہاں کی تاریخ کا سنہرا ورق ہے۔

حضرت مولاناؒ کی سرپرستی اور مزاج کی ہم آہنگی نے آپ کو عالمِ اسلام کے لیے بڑا دردمند بنا دیا تھا، ساتھ ہی ساتھ ریڈیو کی طویل ملازمت نے آپ کو براہِ راست ساری دنیا سے جوڑ دیا تھا۔ رہنمائی کے ساتھ علم وفضل یکجا ہو جائے، اور فکری صلاحیتیں بھی اپنی انتہاء پر پہنچی ہوں نور علی نور، یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس میدان میں حضرت مولانا کے صحیح جانشین آپ ہی تھے۔ عالمی صحافت پر ایسی نظر رکھنے والے کم ہی ہوں گے۔ لکھنؤ میں رہ کر انڈیپنڈنٹ برطانیہ کے کالم نگار روبرٹ فیسک وغیرہ عالمی تجزیہ نگاروں کے آپ مستقل قاری تھے۔

مولانا نے دنیا کی دستیاب آسائشوں کو ترک کر کے بڑی زاہدانہ زندگی گزاری، یہ صرف آپ پر کہاں موقوف، ان کے دادا حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے وحدتِ امت کے لیے خلافت قربان کی تھی۔ خاندانِ سادات کی اس شاخ کے بزرگوں نے بھی دنیا اور منصب کو پرکاہ کے برابر نہ سمجھنے کا نمونہ قائم کیا، اس گئے گزرے دور میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بھانجوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ

ایسے بھلے لوگوں سے دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی۔

آپ نے ندوہ کے معتمد تعلیمات رہ کر یہاں کے تعلیمی اور تربیتی معیار کو بلند تر کرنے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کیں۔ چالیس سال سے زیادہ عرصہ ''الرائد'' کی ادارت سے وابستہ رہے اور پینتیس سال سے زیادہ ''البعث الإسلامي'' کی ادارت سے، ان مجلّات کو آپ کی توجہات اور تحریروں سے بڑا وزن ملا، اور دنیا نے ان سے رہنمائی پائی۔ آپ کی رحلت سے برصغیر میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے، وقت گزرتے گزرتے اس کی شدت کا احساس بڑھے گا، آپ نے اس دنیا میں ایک طبعی عمر گزاری، لیکن محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے یہ پچاسی سال بہت کم تھے، زندگی کی اتنی ہی مہلت مزید ملتی تو بھی علم وفضل کا یہ کنواں خالی نہیں ہوتا، پیاسوں کی سیرابی کا سامان مزید ملتا۔ ہم خوش قسمت تھے جو کردار و اخلاق کی ایسی مثالیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو ملیں، ایسی مثالیں ہی کانٹوں بھری راہوں میں چلنا آسان کردیتی ہیں، اب اپنے اعمالِ حسنہ کے ساتھ مولانا اپنے خالق کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں، ہم سب کو بھی دیرسویر وہاں جانا ہے، لیکن وہ بھی کیسے خوش قسمت تھے، جن کی زندگی آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن گئی، جس کی روشنی میں رہتی دنیا تک رہنمائی ملتی رہے گی۔

.....❀.....❀.....❀....

حضرت مولانا جمیل احمد قاسمی سکروڈھوی رحمۃ اللہ علیہ

(اُستاذ دارالعلوم دیوبند وشارح کتبِ کثیرہ)

مولانا شفیق احمد بستوی
مہتمم جامعہ خدیجۃ الکبریٰؓ، محمد علی سوسائٹی، کراچی

ازہرِ ہند مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کو گزشتہ دنوں ایک اور بڑے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا، جب درسِ نظامی کے ایک کامیاب ترین مدرس اور مایہ ناز شارح حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال پیش آیا۔

حضرت مولانا کی شخصیت پاک وہند بلکہ بنگلہ دیش اور پورے اس برِعظیم میں طبقۂ علماء وطلبہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، کیونکہ ''الهداية'' کی شرح ''أشرف الهداية''، ''نور الأنوار'' کی شرح ''قوت الأخيار''، ''أصول الشاشي'' کی شرح ''أجمل الحواشي''، ''منتخب الحسامي'' کی شرح ''فیضِ سبحانی'' اور ''مختصر المعاني'' کی شرح ''تكميل الأماني'' ایسی معروف ومشہور شروحات ہیں جن سے برِعظیم کے اکثر علماء وطلبہ بخوبی واقف ہیں اور تقریباً ہر ایسے مدرسہ کی لائبریری میں یہ ضرور موجود ہوں گی جس میں درسِ نظامی کا سلسلہ ہے۔

مذکورہ بالا شروحات کے مطالعہ سے ہی مولانا کے اندازِ افہام وتفہیم کی بے مثال خوبی کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت کو اللہ تعالیٰ نے دروس کو سمجھانے کی خوب مہارت عطا فرمائی تھی اور اس کا مشاہدہ راقم الحروف کو اچھی طرح ہوا ہے، جس کا تذکرہ آنے والی سطروں میں ہوگا۔

کچھ تذکرہ مولانا کے طالب علمانہ ماضی کا کرلیا جائے، تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن احوال وماحول سے نکل کر آپؒ کی شخصیت پروان چڑھی۔

ضلع سہارن پور کے شمال مغرب میں واقع قصبہ سکروڈھہ میں ۱۹۴۶ء میں پیدا ہوئے، یہ ایک ایسا قصبہ ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد آبادی کے لحاظ سے بھاری حصے پر مشتمل ہے اور یہ لوگ کھیتی

باڑی کرنے والے زمین دار ہیں، جن کا بڑا ذریعۂ معاش یہی زمین داری ہے، چنانچہ مولانا بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا کے خاندان میں دو افراد علمِ دین کے میدان میں آگے بڑھے اور پورا درسِ نظامی مکمل کر کے اشاعتِ علومِ دینیہ کی خدمات میں مصروفِ عمل ہوئے، ان میں سے ایک مولاناؒ کی شخصیت تھی، دوسرے نمبر پر حضرت مرحوم کے چچا زاد بھائی مولانا محمد تحسین صاحب ہیں، جو کہ بقیدِ حیات ہیں۔ حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، جبکہ مولانا محمد تحسین صاحب نے مظاہر علوم سہارن پور سے فراغت حاصل کی۔ مولانا کا سنِ فراغت تقریباً ۱۹۷۰ء ہے۔ جس سال مولانا مرحوم دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے، اس سال دو ستارے دارالعلوم کی فضاء میں زیادہ عیاں تھے، یعنی طلبہ کے ماحول میں یہ دونوں امتیازی حیثیت کے حامل سمجھے جاتے تھے، ایک کا نام ''جمیل احمد'' تھا، تو دوسرے کا نام ''شکیل احمد'' تھا۔ یہ دونوں بھائی نہیں تھے، بلکہ دونوں ہم عصر و ہم جماعت تھے۔ مولانا شکیل احمد سیتاپوری تھے اور حضرت مولانا سہارن پوری تھے، مگر مولاناؒ نے اپنی کتابوں پر اپنی نسبتِ وطنیہ اپنے مقامِ پیدائش قصبہ سکروڈھہ کی طرف لکھی، جس کی وجہ سے آپ کو سکروڈھوی کی نسبت سے ہی جانا پہچانا جانے لگا۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا شکیل احمد صاحب سیتاپوری دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرس ہوئے اور اپنے اساتذہ واکابرِ دارالعلوم کی معیت وسرپرستی میں مشغلۂ تدریس میں منہمک ہوگئے اور حضرت مولانا مرحوم اپنے برادرِ مکرم مولانا تحسین صاحب مدظلہٗ کی معیت ورفاقت میں مدرسہ قاسم العلوم گاگل ہیڑی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ یہ ادارہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی یادگار کے طور پر قائم کیا گیا ہے جو کہ دیوبند سے سہارن پور جانے والے جی ٹی روڈ اور سہارن پور سے دہرہ دون جانے والی شاہراہ کے سنگم پر واقع ہے۔ گاگل ہیڑی کے اس مدرسہ میں مولانا تحسین مظاہری صاحب مہتمم اور حضرت مولانا مرحوم ناظمِ اعلیٰ تھے، چنانچہ اس مدرسہ میں دونوں ہی عظیم الشان درس گاہوں یعنی دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کے فیوض وبرکات پہنچتے رہے اور دونوں جگہوں سے اکابر کی تشریف آوری اس ادارے میں ہوتی تھی، اور طلبہ واساتذہ کو ان اکابر کی زیارت کا موقع مل جاتا تھا۔ احقر کو اچھی طرح یاد ہے کہ اسی ادارے میں سب سے پہلے حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور دیگر حضرات کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔

یہ کوئی ۱۹۷۶ء یا ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب مدرسہ ہٰذا کے طلبہ کو یہ اُڑتی ہوئی خبر معلوم ہوئی کہ حضرت ناظم صاحب دیوبند جانے والے ہیں اور ان کا تقرر دارالعلوم میں ہوگیا ہے، چنانچہ کچھ ہی

مدت بعد حضرت مرحوم دیو بند تشریف لے گئے اور دار العلوم میں تدریس کا آغاز فرمایا اور اپنے پیچھے مدرسہ قاسم العلوم گاگل ہیڑی کی تمام تر ذمہ داریوں کا بوجھ ظاہر ہے کہ اپنے بڑے بھائی مولانا محمد تحسین مظاہری مدظلہٗ کے کندھوں پر ہی چھوڑا جس کو وہ بخوبی نبھا رہے ہیں ۔

احقر جب مدرسہ قاسم العلوم گاگل ہیڑی سے حفظ القرآن مکمل کر کے دار العلوم دیو بند میں داخل ہوا تو درجۂ ثانیہ میں حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ سے ''هداية النحو '' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا اور یہ تھوڑی ہی مدت تک سبق چل سکا کہ دار العلوم کا قضیۂ نامرضیہ پیش آیا اور یہ سبق بھی دیگر تمام اسباق کی طرح موقوف بلکہ معطل ہو گیا اور چند مہینوں تک اسباق کا سلسلہ تعطل کا شکار رہا۔تقریباً چھ ماہ کی مدت کے بعد جب طلبۂ دار العلوم کو مادرِ علمی کی آغوش میں واپسی کا موقع ہوا تو انتظام وانصرام کی صورت حال بدل چکی تھی کہ طلبہ کی سرپرستی کرنے والے صرف چند اساتذہ رہ گئے تھے، جو کہ طلبہ کے ساتھ رہے اور دار العلوم سے انخلاء کی شش ماہی مدت میں بھی ان کی تعلیم وتربیت کی خدمات انجام دیتے رہے اور اساتذۂ کرام کی بڑی تعداد دار العلوم کی منتظمہ کے ساتھ رہی، تاہم طلبہ کی تعداد کافی کم رہی۔ ان ہی اساتذہ کرام میں حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ بھی شامل تھے۔ جب طلبۂ کرام کی بھاری اکثریت جو کہ چھ ماہ تک خیموں اور کیمپ میں اپنی تعلیم وتربیت میں مشغول تھی، دار العلوم میں واپس آئی تو سارا نظام حضرت مولانا وحید الزماں صاحب کیرانویؒ کی قیادت میں فعال ہوا اور باضابطہ تعلیمی مشاغل بحال ہوئے تو منتظمۂ سابق دار العلوم سے خود بخود بے دخل ہو گئی، تاہم ان حضرات نے بھی تھوڑی سی مدت کے بعد دیو بند کی جامع مسجد میں تعلیمی سلسلہ شروع فرمایا اور نئے داخلوں کا اعلان ہوا تو طلبہ کی ایک بڑی تعداد پورے ملک سے جامع مسجد میں داخلے کے لیے آپہنچی۔ جامع مسجد دیو بند شروع ہونے والے اس نئے تعلیمی وتربیتی ادارہ کو ''دار العلوم وقف دیو بند'' کا نام دیا گیا، کئی سال تک یہ ادارہ مسجد ہی میں کام کرتا رہا اور طلبہ کے لیے رہائش گاہوں کا انتظام شہر کے مختلف علاقوں میں کرایہ پر عمارتیں لے کر کیا گیا تھا، تاہم چند سالوں بعد دیو بند کی شہری آبادی سے باہر مغربی سمت میں دیو بند کی عیدگاہ اور حضرت شیخ الہندؒ کے باغ کے درمیان ایک بڑی اراضی خریدی گئی اور اس پر اب دار العلوم وقف کی ایک بڑی عمارت قائم ہے۔ دار العلوم وقف کے مدیر ومہتمم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحبؒ تھے۔

قابلِ ذکر حقیقت یہ ہے کہ منجھے ہوئے ماہر اساتذہ کرام کی بڑی تعداد دار العلوم وقف میں مشغول رہی، تاہم مرورِ زمانہ کے ساتھ حالات وواقعات میں نرمی آتی گئی اور باہم دونوں ہی مراکز کے اساتذۂ کرام اور طلبائے کرام آپس میں میل جول رکھنے لگے اور دوریاں قربتوں اور لاتعلقی روابط

میں ڈھلنے لگی، اسی اثناء میں محدثِ کبیر حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے عیدگاہ اور مزارِ انوری کے متصل ایک شان دار ادارہ قائم کیا جس کا نام ''جامعة الإمام أنور شاه '' ہے، جس کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ اس میں شروع سے ہی عربی زبان میں اسباق پڑھائے جاتے ہیں، گویا یہ ادارہ عربی میڈیم ہے۔ اس کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم وقف کے کئی اساتذہ کرام نے امتیازی تعلیم وتربیت کی غرض سے اپنے صاحبزادگان کو ''جامعة الإمام أنور شاه '' میں داخل کرایا، چنانچہ دونوں ہی مراکز کے اساتذہ اس وجہ سے بھی آپس میں قریب ہوئے۔

اور احوالِ باہمی کی بہتری کی صورت میں حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ ۲۰۰۰ء میں دارالعلوم وقف سے چھٹی لے کر مرکزی دارالعلوم دیوبند تشریف لے آئے، اور اپنی تدریسی خدمات میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ حضرت مولانا مرحوم کی تدریس میں جو بڑی خاص بات تھی، وہ یہ کہ سبق کی توضیح وتفہیم ایسے دل کش انداز میں فرماتے تھے کہ طالب علم کو درس گاہ میں سبق نہ صرف سمجھ میں آجاتا تھا، بلکہ ذہن نشین بھی ہوجاتا تھا۔ حضرتؒ کی توضیح وتفہیم کی منہ بولتی تصویر نہیں بلکہ تصویریں درسِ نظامی کی عظیم کتاب ''الهداية'' کی شرح ''أشرف الهداية''، ''نور الأنوار '' کی شرح ''قوت الأخيار ''، ''أصول الشاشي '' کی شرح ''أجمل الحواشي ''، ''منتخب الحسامی '' کی شرح ''فیضِ سبحانی'' اور ''مختصر المعاني '' کی شرح ''تكميل الأماني '' ہیں، جن کو توجہ سے پڑھنے والا بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ پاک نے حضرت مرحوم کو تفہیمِ دروس کا کیسا ملکہ عطا فرمایا تھا۔

حضرت مرحوم کی گفتگو بڑی صاف، واضح اور بلیغ ہوتی تھی، تاہم دوآبہ کے علاقے کی اُردو زبان میں جو بے لچک کڑا پن ہے، وہ حضرت مرحوم کے اندازِ کلام میں بھی عیاں تھا۔ حضرت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ سامنے والے سے متاثر نہیں ہوتے تھے، بلکہ بجا طور پر اس کو متاثر کرتے تھے، حضرتؒ کو اپنے مشغلۂ تدریس سے اتنی محبت تھی کہ زندگی میں کوئی دوسری مشغولیت اختیار نہیں فرمائی، ہاں! البتہ اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کتابوں کا کاروبار کیا تھا، چنانچہ آپ نے ''مكتبة الحجاز '' کے نام سے ادارہ قائم کیا۔ آج سے تقریباً گیارہ سال قبل جب دیوبند حاضری ہوئی تو ایک دن بعد المغرب کا وقت تھا، حضرت مولانا عبدالرشید بستویؒ کے ساتھ احقر دارالعلوم وقف کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں حضرتؒ کا ''مكتبة الحجاز '' آگیا تو مولانا عبدالرشید بستویؒ نے فرمایا کہ: حضرت مولانا جمیل صاحب مکتبے میں تشریف فرما ہیں، چلیں اسی وقت ملاقات ہوجائے، چنانچہ ہم بے تکلف سلام کرکے مکتبہ میں داخل ہوئے، حضرت سے ملاقات ہوئی۔ حال احوال کے بعد احقر نے پوچھا کہ حضرت! یہ کتب کی پیکنگ اور بنڈل سازی آپ خود ہی کررہے ہیں؟ تو حضرتؒ نے ازروئے

ظرافت یوں جواب دیا: مولوی شفیق! یہ تو بس اُٹھک بیٹھک ہے اور ہم ہیں اس کام میں ناتجربہ کار، اس لیے بھی ہم جیسا اناڑی آدمی تو ہی اُٹھک بیٹھک کرے ہے اور کیا کرے ہے؟'' بات یہ تھی کہ حضرتؒ کے مکتبہ پر کام کرنے والا لڑکا کہیں گیا ہوا تھا تو حضرت خود ہی کتابوں کے بنڈل بنانے اور ترتیب دینے میں مشغول تھے۔ دورانِ گفتگو حضرت نے شفقت فرماتے ہوئے ہمیں فرمایا کہ: کسی دن ہمارے گھر آجاؤ تو ذرا اطمینان سے بیٹھک رہے گی، چنانچہ ہم موقع مناسب پا کر ایک دن بعد المغرب حضرت کے گھر جا پہنچے، کافی دیر تسلی بخش ملاقات رہی، حضرتؒ نے اس ملاقات کے دوران اپنے سفرِ پاکستان کی کچھ روداد بھی سنائی جو ایک گونہ دلچسپی پر مشتمل تھی۔ احقر کی حضرت سے یہی آخری ملاقات تھی اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب کہ پرویز مشرف نے لال مسجد پر دھاوا بولا تھا تو ہندوستان کے لوگ ہم سے یہی سوال کرتے تھے کہ بھئی! آپ کے ملک میں یہ کیا ہو رہا ہے کہ حکومت خود ہی مسجد پر اٹیک کر رہی ہے تو ہم یہاں بابری مسجد اور دیگر مساجد پر ہونے والے حملوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں؟

بہرحال ایک وقت تھا جو گزر گیا، لیکن حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ کو ہم نے قریب سے دیکھا، مگر ایک شان دار استاذ، ایک بہترین شارح اور مصنف ہونے کے باوجود کوئی بناوٹ، تصنع یا کبر وغرور وخود پسندی نام کی کوئی چیز حضرت میں نہیں نظر آئی۔ بے جھجک، بے لاگ اور بے تمہید وبے تکلف گفتگو آپ کے مزاج کی نمایاں صفت تھی۔ حضرت مولانا جمیل احمد سکروڈھویؒ نے ۷۳ سال کی عمر پائی جس میں سے تقریباً چالیس سال دارالعلوم دیوبند میں تدریس کرتے ہوئے گزاری:

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت مولانا مرحوم جب مدرسہ قاسم العلوم گاگل ہیڑی کے ناظم اعلیٰ تھے، اس وقت حضرت کا ایک صاحب زادہ تھا جس کا نام یاد پڑتا ہے کہ ''خلیل'' تھا، جو راقم الحروف سے عمر میں تین چار سال چھوٹا رہا ہوگا، حضرت کا یہی ایک بیٹا احقر نے دیکھا ہے، اس کے بعد حضرتؒ کی گھریلو زندگی اور خاندان کی تفصیل علم میں نہیں آئی، تاہم دیگر کئی حضرات نے بھی حضرت مرحوم کی سیرت وشخصیت پر مضامین لکھے ہوں گے، بالخصوص ہندوستان میں تو ان کے ذریعے بھی خاندانی تفصیل معلوم ہوسکتی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت مولانا جمیل صاحبؒ جیسے لوگ بڑی مدتوں میں لاکھوں میں سے کوئی اِکا دُکا ہی پیدا ہوتے ہیں۔ حضرتؒ نے اپنی عمر کا آخری سال ایک شدید موذی اور تکلیف دہ بیماری میں گزارا ہے، وہ کینسر کا مرض ہے جو حضرتؒ کو گزشتہ ایک سال سے لاحق تھا۔ اللہ تعالیٰ حضرت

مرحوم کے درجات کی بلندی اور کفارۂ ذنوب کے لیے اس شدید بیماری کو ذریعہ بنا دے، تو اس کی شان کریمی سے کیا بعید ہے، جیسا کہ مختلف روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ پاک جب اپنے بندۂ مومن کو گناہوں سے پاک صاف کرکے اُٹھانا چاہتے ہیں تو اس کو کسی بیماری میں مبتلا فرما دیتے ہیں اور پھر اسی بیماری کے نتیجے میں اس کو موت کے مرحلے تک پہنچا دیتے ہیں اور اس بیماری جھیلنے کی عوض اس کو گناہوں سے پاک صاف کرکے اُٹھا دیتے ہیں، چنانچہ ہم سب اللہ رب العزت کی شانِ کریمی سے اُمید واثق رکھتے ہیں کہ وہ حضرت الاستاذ مرحوم کی کامل مغفرت فرما کر انہیں درجات کی بلندی نصیب فرمائے گا۔

حضرت مرحوم نے اپنے پسماندگان میں اہلِ خاندان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں تلامذہ اور معتقدین چھوڑے ہیں، جو نہ صرف حضرت کے لیے دعائے خیر کا اہتمام کرنے والے ہیں، بلکہ وہ درحقیقت حضرت کے لیے بیش بہا صدقۂ جاریہ بھی ہیں کہ وہ علم وعمل کی دنیا میں حضرت مرحوم کے فیوض وبرکات کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں اور آگے ان تلامذہ کے تلامذہ اس سلسلے کو آگے جاری رکھیں تو اس طرح ان شاء اللہ! قیامت تک یہ صدقۂ جاریہ باقی رہے گا اور اس کا بہت بھاری اجر وثواب اللہ تعالیٰ حضرت کو عطا فرماتے رہیں گے۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرتؒ نے تقریباً چالیس سال تک تدریس فرمائی، اس اعتبار سے بلاواسطہ آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں میں ہے، تاہم آپ کی مقبولِ عام شروحات سے جن طلبہ اور اساتذہ نے استفادہ کیا اور کر رہے ہیں ان کی تعداد بھی بلاواسطہ تلامذہ کی تعداد سے دوگنی بلکہ چوگنی زیادہ ہوگی۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ حضرتؒ کو اپنے شایانِ شان بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے، اور اپنے مقبول ومحبوب بندوں میں شامل فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

اپریل ۲۰۱۹ء کی پہلی تاریخ بروز پیر صبح نو بجے دارالعلوم کے احاطۂ مولسری میں آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں دونوں دارالعلوم اور ''جامعة الإمام أنور شاہ'' کے طلبہ واساتذہ کے علاوہ تقریباً مجموعی طور پر پچاس ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ نماز حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب منصور پوری مدظلہٗ نے پڑھائی اور بعد ازاں آپ کو سوگوار ماحول میں مزارِ قاسمی نامی قبرستان میں اکابر دارالعلوم کے مبارک پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم پر اپنے شایانِ شان کامل رحمت فرمائے اور رفعِ درجات سے نوازے اور تمام ہی پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

عورت کا فرض نماز اور تراویح باجماعت کے لیے مساجد میں حاضر ہونا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

ہماری مسجد .... میں رمضان کے مہینے میں نمازِ تراویح میں خواتین بھی شریک ہوتی ہیں، جن کے لیے ایک کمرہ مختص کیا گیا ہے، جو کہ مسجد ہی میں شامل ہے۔ گزشتہ سالوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ کچھ حضرات اس کے حق میں ہیں کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہنا چاہیے، لیکن کچھ حضرات کو اس پر اعتراض ہے اور کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ بند ہونا چاہیے، اس لیے کہ اکثر علماء اس سے منع کرتے ہیں۔ اب کمیٹی کی طرف سے آپ حضرات کی خدمت میں استدعا ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں، جس کے مطابق ہم عمل کرسکیں۔ جزاکم اللّٰہ خیرا. المستفتی: محمد طارق، کراچی

الجواب حامدًا ومصلیًا

واضح رہے کہ عورت کے لیے نماز ادا کرنے کی بہتر جگہ اس کا اپنا گھر اور گھر کا بھی وہ حصہ جو زیادہ محفوظ ومستور ہو اور اس میں ادنیٰ بھی بے پردگی کا اندیشہ نہ ہو وہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بابرکت زمانہ چونکہ شر وفساد سے خالی تھا، اُدھر عورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے احکام سیکھنے کی ضرورت تھی، اس لیے عورتوں کو مساجد میں حاضری کی اجازت تھی، اور اس میں بھی یہ قیود تھیں کہ باپردہ جائیں، میلی کچیلی جائیں، زینت اختیار نہ کریں، اس کے باوجود صحابہ کرام علیہم الرضوان کا معمول یہ تھا کہ عورتوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’لاتمنعوا نساء کم المساجد، وبیوتھن خیرلھن۔‘‘ (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ، ص:۹۶)

’’اپنی عورتوں کو مسجدوں سے نہ روکو، اوران کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔‘‘

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’صلٰوۃ المرأۃ فی بیتھا أفضل من صلٰوتھا فی حجرتھا، وصلٰوتھا فی مخدعھا أفضل من صلٰوتھا فی بیتھا۔‘‘ (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ، ص:۹۶)

’’عورت کا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا، اپنے گھر کی چاردیواری میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اوراس کا پچھلے کمرے میں نماز پڑھنا اگلے کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔‘‘

بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ کی طرف سے عورتوں کو شرائط کے ساتھ مسجد میں آنے کی اجازت کے باوجود عورتوں کے لیے گھروں میں نماز پڑھنے کو آپ پسند فرماتے تھے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت ام حمید ساعدیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’قد علمت أنکِ تحبین الصلٰوۃ معي وصلٰوتک فی بیتک خیر لک من صلٰوتک فی حجرتک، وصلٰوتک فی حجرتک خیر من صلٰوتک فی دارک، وصلٰوتک فی دارک خیر لک من مسجد قومک، وصلٰوتک فی مسجد قومک خیرلک من صلٰوتک فی مسجدي، قال: فأمرتُ فبني لھا مسجد فی أقصی شیء من بیتھا وأظلمہ، فکانت تصلی فیہ حتی لقیتِ اللّٰہَ عزوجل۔‘‘ (مسند احمد، ج:۱، ص:۳۷۱، وقال الہیثمي: ورجالہ رجال الصحیح غیر عبداللہ بن سوید الانصاري، وثقہ ابن حبان)

’’مجھے معلوم ہے کہ تمہیں میرے ساتھ نماز پڑھنا محبوب ہے، مگر تمہارا اپنے گھر کے کمرے میں نماز پڑھنا گھر کے صحن میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اور گھر کے صحن میں نماز پڑھنا گھر کے احاطے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اوراحاطے میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے، اوراپنے محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا میری مسجد (میرے ساتھ) نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ: حضرت اُم حمید رضی اللہ عنہا نے یہ ارشاد سن کر اپنے گھر کے لوگوں کو حکم دیا کہ گھر کے سب سے دُور اور تاریک ترین کونے میں ان کے لیے نماز کی جگہ بنادی جائے، چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق جگہ بنادی گئی، وہ اسی جگہ نماز پڑھا کرتی تھیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے جاملیں۔‘‘

درج بالا احادیث میں عورتوں کے مساجد میں آنے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منشائے مبارک بھی معلوم ہوجاتا ہے اور حضرات صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذوق بھی۔

یہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ سعادت کی بات تھی، لیکن بعد میں جب عورتوں نے ان قیود میں

کوتاہی شروع کردی، جن کے ساتھ ان کو مساجد میں جانے کی اجازت دی گئی تو فقہائے اُمت نے ان کے جانے کو مکروہ قرار دے دیا۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے:

’’لو أدرک رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ما أحدث النساء لمنعھن المسجد کما منعت نساء بني إسرائیل .‘‘ (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۱۲۰، صحیح مسلم، ج:۱،ص:۱۸۳، مؤطا امام مالکؒ،ص:۱۸۴)

’’عورتوں نے جونئی روش اختراع کرلی ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھ لیتے تو عورتوں کو مسجد سے روک دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا۔‘‘

حضرت اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد ان کے زمانے کی عورتوں کے بارے میں ہے، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے زمانے کی عورتوں کا کیا حال ہوگا؟

الغرض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی نماز کو گھر اور گھر میں بھی اندرونی حصہ میں پڑھنے کو مسجدِ نبوی کی جماعت میں شرکت سے بھی افضل قرار دیا ہے، اور جن قیود وشرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مساجد میں جانے کی اجازت دی، جب عورتوں نے ان قیود وشرائط کو ملحوظ نہیں رکھا تو اجازت بھی باقی نہیں رہی۔ اس بنا پر فقہائے اُمت نے جو درحقیقت حکمائے اُمت ہیں، عورتوں کی مساجد میں حاضری کو مکروہ قرار دیا ہے، گویا یہ چیز اپنی اصل کے اعتبار سے جائز تھی، مگر کسی عارض کی وجہ سے ممنوع ہوگئی ہے۔

اس تمہید کے بعد واضح ہو کہ احناف کے نزدیک عورتوں کا مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے آنا مکروہِ تحریمی ہے، خواہ وہ تراویح ہی کی نماز ہو، چنانچہ ان کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے اور مسجد میں قرآن مجید سننے سے افضل ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مسجد میں عورتوں کا تراویح پڑھنے کا اہتمام کرنا شرعاً درست نہیں، ان کو اپنے اپنے گھروں میں ہی نماز پڑھنے کا کہا جائے کہ اسی میں شریعت کی اتباع ہے، اور شرور وفتن سے حفاظت بھی ہے۔ درمختار میں ہے:

’’(ویکرہ حضورھن الجماعۃ) ولو لجمعۃ وعید ووعظ (مطلقا) ولو عجوزا لیلا (علی المذھب) المفتی بہ لفساد الزمان ۔‘‘ (درمختار،ص:۵۶۵-۵۶۶،ج:۱)

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

’’وکرہ لھن حضور الجماعۃ إلا للعجوز فی الفجر والمغرب والعشاء، والفتوی الیوم علی الکراھۃ فی کل الصلوٰۃ لظھور الفساد‘‘ (فتاویٰ ہندیہ، ج:۱،ص:۸۹) فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
محمد عبدالمجید دین پوری	محمد شفیق عارف	محمد انس انور

دارالافتاء جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

نقد و نظر

ادارہ

تفسیر ہدایت القرآن (کامل سیٹ)

تالیف: حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند)۔ اہتمام وپیشکش: مفتی عبدالرؤف غزنوی، فاضل وسابق استاذ دارالعلوم دیوبند، حال استاذِ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی۔ آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل عمدہ طباعت۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

مؤلف محترم حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم نے تدریس وتالیف اور تحقیق ومطالعہ کے میدان میں تقریباً پچپن سالہ کامیاب تجربے کے بعد تفسیر ہدایت القرآن تحریر فرمائی ہے۔ ان کے افہام وتفہیم کا انوکھا انداز اور درس وتدریس کا کامیاب طریقہ ضرب المثل ہے۔ ان کی تالیفات نے پورے برصغیر کے علمی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے علمی مقام اور ہمہ جہتی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے دارالعلوم دیوبند کی بااختیار اور معزز مجلس شوریٰ نے شیخ الحدیث وصدر المدرسین کے اعلیٰ علمی منصب کے لیے ان ہی کا انتخاب فرمایا۔

اس تفسیر کی ہر سورت کے شروع میں اس کا تعارف اور اس میں پھیلے ہوئے مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر ہر مضمون کے اعتبار سے کبھی ایک ہی آیت اور کبھی چند آیتوں کو لے کر ان کے مفردات کا کالم بنا کر ہر لفظ کے سامنے اس کا لفظی ترجمہ اور پھر دلنشین انداز میں تفسیر اور آخر میں خط کشیدہ الفاظ کے ذریعے بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ آیات وسورتوں کے درمیان ایک ایسا بہترین انداز میں ربط بیان کیا گیا ہے جس سے قرآن کا بنیادی پیغام سمجھنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ عصرِ حاضر

کے قارئین کے مزاج کو سامنے رکھتے ہوئے لمبی تحقیقات اور تفصیلی مباحث کو نہیں چھیڑا گیا ہے، تاکہ قرآن کریم کا اصل پیغام سہولت کے ساتھ دلوں میں اُتر جائے۔ ترجمہ وتفسیر پڑھانے والے اساتذۂ کرام اور پڑھنے والے طلبۂ عزیز کی سہولت کے لیے مشکل الفاظ کی لغوی، صرفی اور نحوی تحقیق اختصار کے ساتھ حاشیہ میں لکھ دی گئی ہے۔

مؤلفِ محترم حضرت مفتی صاحب پالن پوری مدظلہم کے شاگردِ خاص مفتی عبدالرؤف غزنوی فاضل وسابق استاذ دارالعلوم دیوبند، حال استاذِ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نے کتاب کے شروع میں حضرت مؤلف محترم کے علمی مقام اور حالاتِ زندگی اور تفسیر ہدایت القرآن کے امتیازات وخصوصیات کا تذکرہ بھی کردیا ہے، تاکہ قارئین کرام کو علیٰ وجہ البصیرت استفادہ کرنے کا موقع ملے۔

تفسیر ہدایت القرآن مکمل ۸ جلدوں میں پہلی بار پاکستان میں شائع ہوگئی ہے۔ اُمید یہ ہے کہ اس سے اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز، مساجد میں درسِ قرآن دینے والے ائمۂ مساجد اور قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنے کے خواہش مند عام مسلمان سب کے سب استفادہ کریں گے۔

آسان بیان القرآن (جلد اول از ابتداء تاختم سورۃ النساء)

تصنیف لطیف حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ۔ تسہیل نگار: حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی زیدمجدہم۔ نظر ثانی: حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری (شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) مدظلہم۔ اہتمام وپیشکش: مفتی عبدالرؤف غزنوی (فاضل وسابق استاذ دارالعلوم دیوبند، حال استاذِ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی) صفحات: ۶۰۸۔ عمدہ طباعت۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ غزنوی، سلام کتب مارکیٹ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

حکیم الامت حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی تفسیر بیان القرآن محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت تھانویؒ خود فرماتے ہیں: ''تفسیر بیان القرآن میں سب مضامین الہامی ہیں۔'' حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے فرمایا: ''بیان القرآن دیکھ کر مجھے اُردو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔'' آج سے تقریباً ایک سو چودہ سال پہلے ۱۳۲۶ھ کو پہلی بار یہ تفسیر شائع ہوئی اور اس وقت سے آج تک

برابر چھپتی رہی ہے اور اُمتِ مسلمہ کے بے شمار لوگ اس سے فائدہ اُٹھارہے ہیں، البتہ موجودہ دور میں علمی اور تحقیقی مزاج کے فقدان اور اصطلاحات میں تبدیلیاں رونما ہونے کی وجہ سے اس سے استفادہ کرنا مشکل ہوگیا تھا اور اس کی تسہیل کی ضرورت کو ہر خاص و عام محسوس کررہا تھا، لیکن اس الہامی تفسیر کی تسہیل کا کام انجام دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

بالآخر دارالعلوم دیوبند کے ایک پرانے باصلاحیت فاضل اور اُردو زباں کے ادیب حضرت مولانا عقیدت اللہ صاحب قاسمی زیدمجدہم نے بڑی محنت وعرق ریزی کے ساتھ اس کی تسہیل فرماکر حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری شیخ الحدیث وصدر المدرسین دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مہتمم واستاذِ حدیث دارالعلوم دیوبند کی خدمت میں نظرثانی کے لیے پیش کردی، اور پھر تینوں حضرات کے مشورہ سے حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری صاحب کو نظرثانی کے لیے منتخب کیا گیا، جنہوں نے نظرثانی فرمائی اور جہاں جہاں اصلاحات یا تسہیلات کی ضرورت محسوس کی، ان کا اضافہ فرمایا اور عناوین بھی بڑھادیئے، جس سے تسہیل کو چار چاند لگ گئے۔ ''مکمل بیان القرآن'' کے حواشی میں درج شدہ خالص علمی مباحث کو عام قارئین کی سہولت کی خاطر ''آسان بیان القرآن'' میں شامل نہیں کیا گیا۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہم کے شاگردِ خاص مفتی عبدالرؤف غزنوی فاضل وسابق اُستاذ دارالعلوم دیوبند وحال استاذِ حدیث جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی نے پاکستانی ایڈیشن کے شروع میں حضرت حکیم الامتؒ کے حالاتِ زندگی، حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری کے علمی مقام اور تفسیر بیان القرآن کی اہمیت اور اس کی تسہیل کی ضرورت کو واضح کرنے کے لیے ایک مقدمہ بعنوان ''حرفِ آغاز'' لکھا ہے، تاکہ قارئین کرام کو علیٰ وجہ البصیرت استفادہ کرنے کا موقع میسر ہو۔ ''آسان بیان القرآن'' کی جلد اول شائع ہوگئی ہے اور جلد ثانی پریس میں ہے اور باقی تین جلدیں بھی ان شاء اللہ! عن قریب شائع ہوں گی۔

ہدایۃ الدراری لطالبی صحیح الامام البخاری (مقدمہ بخاری)

شیخ الحدیث حضرت مولانا فضل الرحمٰن اعظمی مدظلہ، صفحات: ۳۵۲ عام قیمت: ۵۵۰ روپے، ناشر: ادارہ دعوۃ الحق ٹرسٹ ۹۳۶۲ آزادول، ۱۷۵۰ جنوبی افریقہ۔

زیرِ تبصرہ کتاب حضرت مولانا فضل الرحمٰن اعظمی مدظلہ کی تالیف ہے، جس میں صحیح بخاری کی مبادیات کو ایک سلیقہ اور عمدہ ترتیب سے جمع کیا گیا ہے جس میں اسناد پر سیر حاصل بحث اور تراجم وابواب پر اصولی بحث اور دیگر علمی مباحث بھی ہیں صحیح بخاری پڑھنے اور پڑھانے والوں کے لیے رانہما خطوط ہیں اور یہ کتاب حدیثی معلومات کا ایک بے بہا ذخیرہ ہے۔ مولانا موصوف نے اس کے علاوہ بھی کئی کتب تالیف فرمائی ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہ نے الابواب والتراجم کے بارہ میں پندرہ اصول بھی اس کتاب کا حصہ بنائے ہیں جو ایک مفید اضافہ ہے۔ خلاصہ یہ کہ صرف اس ایک کتاب کو دیکھ لینا صحیح بخاری کی کئی دیگر شروحات سے مستغنی کردیتا ہے۔ بخاری ومسلم کی احادیث مفیدِ یقین ہیں یا نہیں؟! اس عنوان کے تحت جانبین کے دلائل اور اکابر دیوبند کی تحقیقات کو ایسے سلیقہ سے جمع کردیا ہے کہ ہر پڑھنے والے کو اکابر دیوبند کی تحقیقات پر شرح صدر ہوجاتا ہے اور جملہ شکوک وشبہات اصح ہوجاتے ہیں۔

یہ کتاب طلبہ وعلماء حدیث کے لیے ایک عمدہ سوغات ہے۔

تفسیر سورۂ یٰس

مولانا سید محمد متین ہاشمی۔ صفحات: ۱۳۶۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ ناشر: مکتبہ جمال، تیسری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

زیرِ نظر کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سورۂ یٰسین کی تفسیر پر مشتمل ہے، اور اس کے شروع میں ایک بہترین مقدمہ بھی ہے، جس میں توحید، رسالت اور آخرت کو بڑے دل چسپ اور عام فہم پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں سورۂ یٰسین کے چند آزمودہ خواص بھی درج کیے گئے ہیں، تاکہ اگر کوئی صاحب عقیدے کی صحت کے ساتھ ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیں تو فائدہ اُٹھاسکیں۔ بہرحال یہ ان کی ایک کوشش ہے جو اُمید ہے قارئین کے لیے مفید ہوگی۔

بیانات اور تبلیغی کام کے اہم اُصول

افادات: حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب قدس سرہٗ۔ صفحات: ۱۷۵۔ قیمت: درج

نہیں۔ ناشر: بلال انٹر پرائزز، آفس نمبرا-ایس۔ جامع مسجد ناظم آباد نمبر: ۲، انکوائری آفس، کراچی

تبلیغ کے کام میں لگے حضرات اور بزرگوں میں سے ایک بڑا نام حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا بھی آتا ہے، جن کی وفات ۲۵ رجب ۱۴۱۹ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۹۹۸ء کو ہوئی۔ آپ حضرت مولانا محمد الیاس قدس سرہٗ کے تربیت یافتہ، مظاہر علوم سہارن پور کے چشم و چراغ اور حضرت اقدس مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے۔ یہ انہی حضرات کی توجہ کا اثر تھا کہ آپ نے ساری زندگی دعوت وتبلیغ کے کام میں صرف کردی۔ آپ کے انہی اوصاف وکمالات کی وجہ سے بزرگوں نے آپ کی تشکیل مدینہ منورہ میں کی۔

آپ کی محنت وسعی اور دعاؤں کا اثر تھا کہ عرب حضرات بھی اس کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ پاکستان کے مختلف شہروں اور خصوصاً کراچی میں بھی تشریف لاتے رہے۔ محترم جناب اعجاز النبی صاحب- جو عرصہ دراز سے تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوتے رہے- منبر سے کیے گئے بیانات خصوصاً حضرت مولانا سعید احمد خان کے بیانات کو اپنی کاپی میں لکھ لیا کرتے تھے، جو بعض تو کراچی میں ہوئے اور بعض رائے ونڈ میں ہوئے، اس طرح کل انیس بیانات جمع ہوگئے، جو اس کتاب کا حصہ ہیں، اور کتاب کے آخر میں تبلیغی کام کے اہم اصول جمع کیے گئے ہیں۔ یہ بیانات دل کی دنیا بدلنے کے لیے ایک اکسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

تمام مسلمانوں کے لیے عموماً اور تبلیغ میں چلنے والے حضرات کے لیے خصوصاً یہ کتاب بڑی راہنمائی کا ذریعہ ہے۔ امید ہے باذوق حضرات اس کتاب کو ضرور اپنے پاس رکھیں گے۔

سیرت کے نقوش

حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی فاروقی قدس سرہٗ۔ جمع وترتیب: مولانا محبوب احمد صاحب۔ تحقیق وتخریج: مفتی محمد اظہر صاحب۔ صفحات: ۲۸۸۔ قیمت: ۳۰۰ روپے۔ ناشر: مکتبہ عشرہ مبشرہؓ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولین وآخرین کے سردار، تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے امام، اور اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اب تک بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، جو بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی، عربی میں بھی ہیں اور اردو کے علاوہ مختلف زبانوں میں بھی، لیکن کسی نے آج تک یہ

دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا حق ادا کر دیا ہے۔ زیرِتبصرہ کتاب بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ الفاظ مختصر لیکن معنی ومفہوم وسیع ہے، گویا یہ کتاب ''دریا بکوزہ'' کا مصداق ہے۔

حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی قدس سرہٗ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ ''النجم'' اور ''دلکھنؤ'' میں لکھے گئے تھے۔ ان تمام مضامین کو یکجا کرنے کا سہرا مولانا محبوب احمد کے سر ہے۔ کتاب کیا ہے، ایک گوہر نایاب ہے: ۱:-کتاب کا ایک مقدمہ ہے جو عقائدِ اسلامیہ ضروریہ کے بیان میں ہے۔ ۲:-اس کے بعد ''نفحہ عنبریہ بذکر میلادِ خیر البریہ'' کا باب ہے، اس باب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو حیاتِ طیبہ کے ماہ وسن کے اعتبار سے جمع کیا گیا ہے۔ ۳:-مختصر سیرتِ نبویہ بزبان قرآن کریم یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے وہ درخشندہ پہلو جس کو قرآن کریم نے بیان فرمایا۔ اور اس کے شروع میں حضرت مولانا عبدالشکور لکھنوی قدس سرہٗ کا تعارف بھی دے دیا گیا ہے۔

یہ کتاب سیرت کے موضوع پر مختصر لیکن پراثر ہے۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کی قدرافزائی کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی اس سعی وکوشش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

تحفۃ العزیز فی سوانح الشاہ عبدالعزیز (حصہ اول، دوم)

جناب عبدالسبحان شاہ۔ صفحات: ۲۵۵۔ قیمت: درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم، ٹنڈو آدم، پاکستان

زیرِتبصرہ کتاب دعوت وتبلیغ کے ایک بزرگ حضرت مولانا ''عبدالعزیز دعاجو'' قدس سرہٗ کی سوانح پر لکھی گئی ہے، جو عالم باعمل، صوفی باصفا، عارف کامل اور صاحب فتویٰ ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ تقویٰ بھی تھے۔ صرف داعی ومبلغ ہی نہیں، بلکہ اہلِ بصیرت، اہلِ حکمت واہلِ فراست بھی تھے۔ قرآن وسنت کا صرف مطالعہ نہیں، بلکہ عمیق وگہرا مطالعہ بھی رکھتے تھے۔ بہرحال اکابر کی سوانح لکھنے کا مقصد اصلی یہی ہوتا ہے کہ بعد والے اپنے اکابر کے حالات وواقعات پڑھ کر ان سے راہنمائی لیں اور اپنی زندگی کے قیمتی لمحات انہیں کے نقش قدم پر گزار کر دنیا وآخرت میں سرخروئی حاصل کرسکیں۔

کتاب بہت عمدہ ہے، البتہ کاغذ کتاب کے شایانِ شان نہیں اور اس کے صفحات جیسا کہ اوپر درج کیے گئے ہیں، کتاب کے شروع میں ۳۰۸ لکھے گئے ہیں جو درست نہیں۔ اُمید ہے کہ اگلے ایڈیشن

میں اس کی تلافی کی جائے گی۔

نورانی قاعدہ

استاذ القراء حضرت مولانا قاری نور محمد صاحبؒ۔ مرتب: اساتذہ جامعۃ الابرار۔ تصحیح: قاری عبدالمالک صاحب دامت برکاتہم۔ صفحات: ۴۴۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ ناشر: جامعۃ الابرار (للعلوم الاسلامیۃ) ۵۳۳ بی، بلاک ۱۳، نزد قباء مسجد، گلبرگ، کراچی

اس رسالہ میں درج ذیل خصوصیات ہیں:

۱: -قواعد کا انتخاب نورانی قاعدہ کی تختیوں کی مناسبت سے کیا گیا ہے۔

۲: -اردو الفاظ کا چناؤ انتہائی آسان انداز میں کیا گیا ہے، تاکہ بچوں کو پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔

قرآن کریم پڑھنے اور پڑھانے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھنے کی ابتداء نورانی قاعدہ سے کی جاتی ہے، گویا یہ قاعدہ قرآن کریم پڑھنے اور پڑھانے کے اعتبار سے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو جتنا آسان، دل چسپ اور عمدہ انداز میں طبع اور شائع کیا جائے، اُتنا چھوٹے بچوں کی دل چسپی اور رغبت بڑھتی ہے، جو کہ ان کے آگے بڑھنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس قاعدہ کی کتابت، طباعت اور اشاعت میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔

پورا قاعدہ آرٹ پیپر پر ''مُلَوَّن'' طبع کیا گیا ہے۔ قاعدہ ظاہری اور باطنی تمام خوبیوں سے مزین ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے مرتب، مصحح اور ناشر سب حضرات کی محنتوں کو قبول فرمائے۔

آسان نماز اور چالیس مسنون دعائیں مع چالیس احادیث

حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ۔ صفحات: ۸۰۔ قیمت: ۱۰۰ روپے۔ ناشر: جامعۃ الابرار ۵۳۳ بی، بلاک ۱۳، نزد قباء مسجد، گلبرگ، ایف بی ایریا، کراچی

حضرت مولانا محمد خرم عباسی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت عمدہ ذوق عطا فرمایا ہے کہ وہ ہر کتاب چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، بہت ہی خوبصورت اور اعلیٰ انداز میں شائع کرتے ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب (آسان نماز) اگرچہ چھوٹی سی ہے، لیکن دیکھتے ہی جی چاہتا ہے کہ اس کو اپنے پاس ضرور رکھوں۔

یہ کتاب آسان نماز حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی بلندشہری قدس سرہٗ کی تصنیف ہے، جو مکاتبِ قرآنیہ کے بچوں کے لیے انہوں نے لکھی تھی۔ پچاس سال سے ہر خاص وعام اس سے نفع اُٹھارہا ہے۔اس پر مزید یہ کام کیا گیا کہ:

۱:-کتاب کے لیے صفحات انتہائی عمدہ استعمال کیے گئے ہیں۔

۲-تمام کتاب دورنگوں سے ''مُلوَّن'' کی گئی ہے، جو ہر کسی کے لیے دل چسپی کا باعث ہوگی۔

۳:- ہر عنوان کو اپنے انداز میں علیحدہ علیحدہ بریکٹ کر کے پیش کیا گیا ہے کہ ہر عمر والا اس سے استفادہ کر سکے۔

۴:-حروف کو جلی اور واضح رکھا گیا ہے، اس وجہ سے کتاب کے صفحات بڑھ گئے۔

آخر میں مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی جوامع الکلم یعنی چہل حدیث بھی شامل کی گئی ہے۔اُمید ہے باذوق حضرات اس کتاب کو خود بھی پڑھیں گے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیں گے۔